مکاتیبِ

سیّد علی عباس جلالپوری

مُرتّبہ: پروفیسر لالہ رُخ بخاری

ضابطہ

نام کتاب : مکاتیب سیّد علی عبّاس جلالپوری

مُرتّبہ : پروفیسر لالہ رُخ بخاری

ناشر : تخلیقات، لاہور

بار اوّل : جون ۲۰۱۳ء

تعداد : ۱۰۰۰

ادارہ : تخلیقات پبلیکیشنز لاہور

کمپوزنگ : سجاد کمپوزنگ سنٹر، دین پلازہ گوجرانوالہ

قیمت : 300 روپے

انتساب

اُن فلاسفہ اور سائنس دانوں کے نام

جنہوں نے

اہلِ مذہب کے تحکّم کا بے جگری سے مقابلہ کیا

اور

مستقل مزاجی سے

خرد افروزی کی راہ پر چلتے رہے

ترتیب

دانش کو دوام حاصل ہے — اقبال کوثر — ۶
مقدمہ — ڈاکٹر طارق جاوید — ۷
حرفِ آغاز — پروفیسر لالہ رُخ بخاری — ۳۹
شہزادی بیگم (والدہ)، مکتوب بنام لالہ رُخ — ۴۷
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام شہزادی (بیگم علی عباس جلالپوری) — ۴۹ تا ۷۳
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام حامد رضا (پسر) — ۷۴ تا ۸۴
حامد رضا، مکتوب بنام علی عباس جلالپوری — ۸۵
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام جعفر رضا (پسر) — ۸۷ تا ۹۱
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام لالہ رُخ بخاری (دُختر) — ۹۲ تا ۱۲۵
حامد رضا، مکتوب بنام لالہ رُخ بُخاری — ۱۲۶
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام سیّد مراد علی شاہ — ۱۲۹، ۱۳۰
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام جگتار سنگھ — ۱۳۱
سیّد علی عباس جلالپوری، بنام احمد ندیم قاسمی — ۱۳۲؛ ۱۴۱؛ ۱۴۲؛ ۱۵۲؛ ۱۶۰؛ ۱۶۲
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام سیّد سبط الحسن ضیغم — ۱۳۴
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام مشتاق احمد — ۱۳۵؛ ۱۳۹؛ ۱۵۱؛ ۱۵۶
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام گلباز آفاقی — ۱۳۸
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام چودھری محمد امین — ۱۴۰
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام قاضی محمد صدیق — ۱۵۴
سیّد علی عباس جلالپوری، بنام ڈاکٹر ملک — ۱۶۳

سیّد علی عباس جلالپوری، بنام ایم سلیم		۱۴۴
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام نبیلہ		۱۴۶؛ ۱۴۸؛ ۱۵۰؛ ۱۵۳؛ ۱۵۷؛ ۱۶۶
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام زاہد		۱۴۷
سیّد علی عباس جلالپوری، بنام پروفیسر ظفر علی خان		۱۵۴
سیّد علی عباس جلالپوری، خطوط بنام آغا امیر حسین		۱۵۵؛ ۱۶۴
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام سید محمد کاظم		۱۵۸
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام مظفر خان		۱۶۱
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام منیر بھٹی		۱۶۳
سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام کلیم خارجی		۱۶۵
محمد اسلم چیمہ، مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری		۱۶۸
سیّد علی عباس جلالپوری۔۔ میرے استاد	فرحت رابعہ	۱۷۱
سیّد علی عباس جلالپوری۔۔ ایک مثالی اُستاد	پروفیسر حامد رضا	۱۷۷
آفتابِ خرد افروزی	پروفیسر ظفر علی خاں	۱۸۲
علی عباس جلالپوری کے نام مشہور قانون دان ول ڈیورنٹ کے خط کا عکس		۱۸۷
علی عباس جلالپوری کے لیے وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے پرائیڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈ کے سرٹیفکیٹ کا عکس		۱۸۸
تصاویر		

اقبال کوثر

دانش کو دوام حاصل ہے

ذرا اے ہم عزا خوانِ صفِ دانش تحمل!
وہ زندہ لوگ ہیں ہم جن کی تعزیت کو آئے ہیں
دوامِ زندگی ان کو ہی ملتا ہے
جو مانش اور مانکھتا کے سچے داس ہوتے ہیں
جو کائنات وانساں کے
حقائق کے تفکر میں، حقائق کے تفہم میں
ہمہ ایثار کر جاتے ہیں عمریں
چھوڑ کرتر کہ۔۔ان آثار وتواریخ متور کا
دماغ ودل کی خوشبو سے لکھے ان حرف دانش کا
خطِ روشن جو بنتے ہیں
رہِ شب زادہستی میں
سبھی اہلِ سفر کے نام ۔۔اک صورت ابد پیغام کی
صورت
سنو اے ہم عزا خوانِ صفِ دانش!
کہ وہ دیوانگانِ عقل درویشان خود آگاہ
جو اپنے صدق بے پروا سے
اپنے علم ودانش اور جنوں انگیزی افکار کی پاداش میں
بن باس ہوتے ہیں، کبھی مرتے نہیں ہیں
یہ جہلم کے، جو دنیا بھر کے جس خطے کے اندر بھی
علی عباس ہوتے ہیں کبھی مرتے نہیں ہیں
وہ زندہ لوگ ہیں ہم جن کی تعزیت کو آئے ہیں

ڈاکٹر طارق جاوید

مقدمہ

میدانِ فلسفہ کے شہسوار جناب علی عباس جلالپوری (ولادت: ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء ڈنگہ ضلع گجرات وفات: ۶۔ دسمبر ۱۹۹۸ء جہلم) برصغیر میں خرد افروزی کی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے فلسفے کو تجرید کے دائرے سے باہر نکال کر عمل کے ساتھ آہنگ کرتے ہوئے جس وحدت کو متشکل کیا اس میں موجود (مقامی و عالمی انسانی صورتِ حال؛ فطرت) کے مقدر کو انسان کے ہاتھوں بہترین سمت دینے کی کاوش، یقین اور نوید ہے۔ اوّل الذکر کو خصوصاً محنت کش طبقات کے انقلابی عمل سے بزور توڑ کر نئی ساختوں میں ڈھالنے سے مشروط کر کے علی عباس جلالپوری خود اپنی سمت، یعنی قبیلے کے ساتھ وابستگی کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔

علی عباس جلالپوری اُن نوابغ عالم میں سے تھے جنہوں نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کیا، خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑی۔ اقبالؔ پر تحریر کردہ ان کے مضامین پر سخت ہنگامے کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان کا موقف تھا کہ اقبالؔ فلسفی نہیں متکلم ہیں، کیونکہ ایک فلسفی فرد، حیات اور کائنات کے حوالے سے مدلل و مربوط نظامِ فکر فراہم کرتا ہے۔ اس ضمن میں بشیر احمد ڈار اور عام فکری مغالطوں کے حوالے سے محمد ارشاد کے ساتھ "فنون" میں بحثوں کا طویل سلسلہ جاری رہا۔

علی عباس جلالپوری صفِ اول کے عالم تھے اور اُن کی کتب پاکستان میں عہدِ خرد کی پیش رو اور نقیب ہیں۔ انہوں نے روایاتِ فلسفہ کے ذریعے عام اردو قاری کو فلسفیانہ موضوعات سے متعارف اور ول ڈیورنٹ کی "Story of Philosophy" کی طرح قبولیتِ عام بخشنے کی سعی کی۔ ول ڈیورنٹ کی تاریخ کی کتاب میں پائی جانے والی اغلاط کی انہوں نے تفصیل سے نشاندہی کی، جوابی خط

میں ول ڈیورنٹ نے وعدہ کیا کہ آئندہ اڈیشن میں وہ ان اغلاط کی تصحیح کر دے گا۔''

علی عباس جلال پوری کی اب تک درج ذیل سولہ کتب شائع ہو چکی ہیں:

''روایاتِ فلسفہ''، ''روحِ عصر''، ''عام فکری مغالطے''، ''اقبال کا علم الکلام''، ''مقاماتِ وارث شاہ''، ''تاریخ کا نیا موڑ''، ''رسومِ اقوام''، ''جنسیاتی مطالعے''، ''کائنات اور انسان''، ''روایاتِ تمدنِ قدیم''، ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری''، ''ساڈے وڈکیاں دی سوجھ'' ''مقالاتِ جلال پوری''، ''خرد نامہ جلال پوری''، ''پریم کا پنچھی پنکھ پسارے''، ''مکاتیب علی عباس جلالپوری''۔

''مقالاتِ جلالپوری'' کے پہلے حصہ کی اشاعت کے بعد ان کا ناولٹ: ''پریم کا پنچھی پنکھ پسارے'' جنوری ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ چھیانوے صفحات پر مبنی یہ ناولٹ ان کی عمرِ عزیز کے اس حصہ کی یادگار ہے جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے، بعد میں ان کے رُجحانات کا رخ فلسفے، تہذیب، تاریخ، سماجیات اور ادبی تنقید کی طرف مڑ گیا۔ اس ناول کے مسودے کو انہوں نے ایک طرف رکھ دیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ناول کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ ان کی دُختر پروفیسر لالہ رُخ بخاری کے مطابق ۱۹۸۰ء میں ہوسٹل سے جب وہ جلال پور شریف گئیں تو ایک دن ردی کاغذوں کے کچھ ٹکڑے نظر آئے، جن پر لکھی تحریر پڑھنے سے ان پر لکھی ادبی تحریر دلکش محسوس ہوئی۔ جب مسودے کے ٹکڑوں سے یہ پریم کہانی انجام تک پڑھی تو اسے ضائع کرنے کو جی نہ چاہا لہٰذا اسے ایک کاپی پر تحریر کر لیا۔ کچھ دنوں بعد انہیں والد صاحب کی کتب میں سے ایک نوٹ بک ملی جس میں یہی کہانی تحریر تھی۔ غالباً مسودے سے نوٹ بک میں اسے اُتار کر مسودے کو پھاڑ دیا گیا تھا۔

دراصل علی عباس جلالپوری اپنے اس ناول کی اشاعت کے حوالے سے آخر تک گومگو کی کیفیت میں رہے مگر انہوں نے اسے ضائع نہ کیا۔ پروفیسر لالہ رُخ بخاری نے اس ناول کو شائع کر کے درست اور جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

پروفیسر لالہ رُخ بخاری کا اسی قبیل کا ایک اور جرأت مندانہ فیصلہ ''مکاتیب علی عباس جلالپوری'' کی اشاعت ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں علی عباس کے ایک سو ایک خطوط شامل ہیں، جو نجی یا خانگی، دوست احباب اور ادیبوں وغیرہ کے نام ہیں۔ ان خطوط کی تفصیل اس طرح ہے:

مکتوب الیہ	تعداد
شہزادی (بیگم علی عباس جلالپوری)	۲۵
حامد رضا (پسر)	۱۰
جعفر رضا (پسر)	۰۵
لالہ رُخ بخاری (دختر)	۲۸
سیّد مراد علی شاہ	۰۲
جگتار سنگھ	۰۱
احمد ندیم قاسمی	۰۶
سیّد سبط الحسن ضیغم	۰۱
مشتاق احمد	۰۴
گلباز آفاق	۰۱
چودھری محمد امین	۰۱
قاضی محمد صدیق	۰۱
ڈاکٹر ملک	۰۲
ایم سلیم	۰۱
نبیلہ	۰۶
زاہد	۰۱
پروفیسر ظفر علی خان	۰۱
منیر بھٹی	۰۱
آغا امیر حسین	۰۲
سیّد محمد کاظم	۰۱

کلیم خارجی ۰۱

کل تعداد ۱۰۱

ان خطوط میں ایک انگریزی (لالہ رُخ کے نام)، تین پنجابی (جگتار سنگھ، سبط الحسن، زاہد کے نام) جبکہ دیگر تمام اُردو میں تحریر کردہ ہیں۔

لالہ رُخ نے اپنے نام والدہ اور حامد رضا کے دو خطوط بھی شامل کر دیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں محترم پروفیسر حامد رضا کا ایک خوبصورت اور وقیع مضمون: ''علی عباس جلالپوری ۔۔ایک مثالی اُستاد'' علی عباس جلالپوری کی شخصیت کے کئی گوشوں پر منفرد انداز کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔

علی عباس جلالپوری کے مکاتیب کو مرتب کرنے والی قوتِ محرکہ پروفیسر لالہ رُخ بخاری کی اپنے والدِ گرامی کے ساتھ شدید قلبی وابستگی ہے۔ انہیں زندگی میں قدم قدم پر اپنے عظیم والد کی راہنمائی حاصل رہی۔ قدرت نے انہیں والد کی خدمت کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی، شخصیت، ذہنی میلانات، اندازِ زیست اور علمی کام اور اس کام کو انجام دینے کے مخصوص طریقۂ کار کو قریب سے دیکھنے کے مواقع عطا کیے۔ ۱۹۸۴ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور فالج کے باعث ان کا دہنا ہاتھ لکھنے سے قاصر ہو گیا، تو بیماری کے دورانیے میں بیشتر خطوط انہوں نے لالہ رُخ ہی سے لکھوائے۔ زیرِ نظر کتاب کے ''حرفِ آغاز'' میں لالہ رُخ کی درج ذیل تحریر بہت اہمیت کی حامل ہے:۔

> ''والدِ گرامی کا مجھ سے بحیثیت بیٹی، لیکچرار، تیماردار، رازدار ایک خصوصی تعلق تھا، جس کی بدولت میری ان کے ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ اکثر موصول ہونے ہونے خطوط کے جوابات بھی مجھ ہی سے لکھوایا کرتے تھے۔ میری عدم موجودگی میں حامد بھائی جان یا جعفر بھائی بھی یہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ پہلے خط کی املاء کروایا کرتے۔ پڑھنے کے بعد عبارت میں قطع و برید کرواتے، دوبارہ پڑھتے اور صاف کر کے لکھواتے۔ میں صاف کر کے تحریر کو سپرد ڈاک کر دیتی اور

ترمیم شدہ تحریروں پر مبنی کاغذات محفوظ رہتے۔ چنانچہ والدِ
گرامی نے جو مجھے یا دیگر اہلِ خانہ کو خطوط تحریر کیے وہ تو
میرے پاس محفوظ تھے ہی لیکن میرے ہاتھ سے لکھوائے
گئے خطوط بھی میرے پاس رہ گئے۔'' [1]

والدِ گرامی سے وابستگی کے ساتھ ساتھ لالہ رُخ کو ان تحریروں کی اصل اہمیت کا بھی ادراک تھا، جس کی وجہ سے ترمیم شدہ تحریروں پر مبنی خطوط بھی ضائع کرنے کے بجائے محفوظ رکھے۔ اگر وہ ان اور دیگر خطوط کو محفوظ نہ کرتیں تو مکاتیب پر مبنی یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آسکتی۔

علی عباس جلال پوری کیسے لکھتے تھے، لکھنے کے دوران میں اُن کی کیا کیفیات ہوتی تھیں؛ اپنی کتب اور تحریروں کو اس زر پرست سماج کے تناظر میں کیسے دیکھتے، اِن اور اِن سے متعلقہ امور پر بھی لالہ رُخ نے روشنی ڈالی ہے:

''کھل کر قہقہہ لگانا وہ فلسفی کے شایانِ شان نہیں سمجھتے
تھے... ''مقاماتِ وارث شاہ'' آدم جی انعام کا اعلان ہوا مگر
سیّد صاحب نے اسے وصول کرنے سے انکار کردیا۔ امجد اسلام
امجدؔ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت نہ ہوئی۔
وجہ یہ تھی کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے اور کسی سرمایہ دار
نمائندہ سے انعام وصول کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔'' [2]

!

'' کائنات اور انسان'' ۱۹۸۹ء میں یہ کتاب شائع ہوئی اس
وقت سیّد صاحب فالج کے موذی مرض سے جوجھ رہے تھے۔
کتاب انہوں نے بائیں ہاتھ میں تھام لی، داہنے ہاتھ میں رعشہ

---

[1] ''حرفِ آغاز'' از پروفیسر لالہ رُخ بُخاری، مشمولہ مکاتیب علی عباس جلالپوری۔

[2] بحوالہ ''تحریکِ خرد افروزی کے بانی ۔۔ سیّد علی عباس جلالپوری'' از پروفیسر لالہ رُخ بُخاری، مطبوعہ ''عنبر'' میگزین گورنمنٹ خواتین کالج سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ (شمارہ ۲۰۰۹ء)، صفحہ ۶۷۔

کی تحریک سے بدن کانپ اٹھا۔ سکون ہوا تو چہرے پر مسرّت کی تمازت لپکی۔ غلافی آنکھوں میں چمک دوچند ہو گئی۔ زرد لبوں پر مسکراہٹ جاگ اٹھی۔ مطالعہ کی وہ امنگ جو عمر بھر رگوں میں سرسراتی رہی تھی، کسمسا کر بیدار ہو گئی۔ یہ کتابیں ہی تو حاصلِ زیست تھیں اور انہیں سرخ رنگ پسند تھا۔ زندگی سے بھرپور جوش جدو جہد کی دھڑکتی علامت! ان کے کزن سیّد برکات احمد (سینیٹر) نے ایک روز بڑی خوشی سے انہیں بتایا ''میری گلبرگ میں تیسری کوٹھی تعمیر ہو چکی ہے'' سیّد صاحب مسکرائے اور کتاب ہاتھ میں لے کر بولے ''میری پانچویں کوٹھی تعمیر ہو چکی ہے۔''[1]

سیّد صاحب علم اور درس و تدریس کو مادی منفعت کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے بے شمار طلبا و طالبات کو بغیر فیس لیے پڑھایا۔ اس سلسلہ میں لالہ رُخ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:۔

'' میری استانی جو کہ ہماری پڑوسن بھی تھیں، نے بی۔ اے پرائیویٹ طور پر پاس کر کے بی۔ ایڈ کا ارادہ کیا۔ والدِ گرامی اُن دنوں اورینٹل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ میری استانی کو بی۔ ایڈ کے کچھ اسباق میں دقت محسوس ہوئی تو وہ والد صاحب سے ملنے تشریف لائیں۔ باتوں باتوں میں مدعا بیان کیا ''چند اسباق پڑھا دیجیے''۔ والد صاحب نے حامی بھر لی، دریافت کیا کہ ''فیس بھی طے فرما دیجیے'' فرمایا: ''فیس دے کر پڑھنا مقصود ہے تو شہر لاہور میں پڑھانے والوں کی کیا کمی ہے۔ میں ایک گھنٹہ بھر روزانہ پڑھاؤں گا مگر فیس لینا باعثِ توہین سمجھتا ہوں۔'' استانی صاحبہ نے کلام تشکر پیش کیا اور اس مددِ بے غرض کا تذکرہ اپنی کئی احباب سے بھی کیا۔ میں نے کہا: ''آپ سرکار سے بھی تو معاوضہ لے کر تعلیم دیتے ہیں۔ فرمایا: وہ ملازمت ہے۔ سرکار تنخواہ دیتی ہے تو طلبہ و طالبات کو یوں پڑھانا چاہیے

[1] بحوالہ ''تحریکِ خرد افروزی کے بانی۔ سیّد علی عباس جلالپوری'' از پروفیسر لالہ رُخ بخاری، ''عنبر'' صفحہ ۸۲۔

کہ وہ ٹیوشن کی حاجت محسوس ہی نہ کریں۔ میں تمہیں افلاطون کا
ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ ایک دن ایک شخص نے افلاطون سے
ریاضی کا سوال پوچھا۔ افلاطون نے اسے سمجھا دیا۔ اس شخص نے
پوچھا، ''اس کا کیا فائدہ ہے؟'' افلاطون نے اس شخص کو سونے کا
ایک سکہ دیا اور کہا ''یہ ایک سوال سیکھنے کا فائدہ وصول کرو اور
آئندہ میرے پاس مت آنا کیوں کہ علم مالی منفعت کے لیے
نہیں ہوتا بلکہ بنی نوع انسان کی قلبی و عقلی وسعت کے لیے ہوتا
ہے۔''[1]

پروفیسر لالہ رُخ کی ان باتوں کی توثیق پروفیسر حامد رضا کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

''انہوں نے ٹیوشن زندگی بھر نہیں پڑھائی البتہ جس کسی نے
رہنمائی چاہی اس کی بخوشی مدد کی۔ وہ بنیادی طور پر استاد تھے۔
ان کی وفات پر جلالپور میں اُن کے ۱۹۴۳ء کے زمانے کے شاگرد
بھی آئے جنہوں نے کہا کہ ایسا استاد ہم نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔
اپنے گاؤں میں اپنے اردگرد جو قابل طالب علم نظر آیا اس کی
سرپرستی اور ہمت افزائی کی تاکہ پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو
سکے۔''[2]

علی عباس جلالپوری کیسے سوچتے اور لکھتے ،اس سلسلہ میں لالہ رُخ کے چند تراشے ہوئے نقوش ملاحظہ کیجیے:۔

''وہ نواڑ کے ایک بڑے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے
کسی غیر مرئی نکتے پر نظریں جمائے کسی نہ کسی فکر میں گم ـــــ بایاں
ہاتھ بستر پر بے حرکت پڑا رہتا اور داہنا ہاتھ آہستہ آہستہ سر کے
درمیانی حصے کو سہلاتا رہتا، سر کے اس حصے پر بال کافی کم ہو گئے
تھے ـــــ ہم بہن بھائی اُن کو سوچ میں مستغرق پا کر گھر میں بالکل

1۔ ''حرفِ آغاز'' از پروفیسر لالہ رُخ بُخاری، مشمولہ مکاتیب علی عباس جلالپوری۔
2۔ حامد رضا، ''علی عباس جلالپوری۔۔۔ ایک مثالی استاذ'' مشمولہ مکاتیب سید علی عباس جلالپوری۔

خاموش ہو جاتے۔ ایسے عالم میں بلند آواز میں گفتگو یا ہمارا قہقہہ زن ہونا انہیں سخت ناگوار گزرتا۔

جب وہ کسی کتاب کی تالیف میں منہمک ہوتے تو شب و روز اُسی کے دھیان میں گم رہتے۔ ایک شب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی تھی۔ رات کے دو بجے تھے نجانے وہ کب بیدار ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں قرطاس تھا اور صریرِ خامہ۔ میں مارے حیرت کے بت بنی تکتی رہی۔ اس وقت کاغذ، قلم کا آہنگ میکانکی سا لگ رہا تھا۔''[1]

منقولہ بالا نقوش کے ساتھ پروفیسر حامد رضا کی لفظی تصویر کشی کو ملا دیا جائے تو منظر نامہ مکمل ہو جاتا ہے:۔

'' ایمرسن کالج ملتان میں بطور لیکچرار اردو تعینات ہوئے۔ وہاں کی لائبریری بہت شان دار تھی۔ جس سے آپ نے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ اس لائبریری کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں آٹھ یا نو سال کا تھا۔ ہمارا گھر پل شوالہ کے قریب تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے بڑا سا صحن جس میں دھول اُڑتی تھی۔ بجلی ندارد اور ابا جان ہیں کہ کالج سے واپسی پر آرام کرنے کے بعد میز کرسی پر بیٹھ گئے اور کسی کتاب سے کاپی پر کچھ منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ملتان کی گرم دوپہر ہے لیکن ادھر ایک ہاتھ میں دستی پنکھا اور دوسرے میں قلم۔ میں لیٹا دیکھتا رہتا حتیٰ کہ اونگھ آ جاتی لیکن جب آنکھ کھلتی یہی منظر سامنے ہوتا۔ ملتان سے ہم گوجرانوالہ آ گئے۔ یہاں میز کرسی کی جگہ غالیچہ نے لے لی۔ اسی طرح لاہور میں میز کرسی اور پلنگ۔ لیکن مطالعہ کرنے، نوٹس لینے اور لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔''[2]

---

[1] ''حرفِ آغاز'' مکاتیب سیّد علی عباس جلالپوری، از پروفیسر لالہ رُخ بخاری

[2] حامد رضا، ''علی عباس جلالپوری۔ ایک مثالی استاد'' مشمولہ مکاتیب سیّد علی عباس جلالپوری۔

گویا ایک فلسفی کی شان، انہماک اور مطالعہ کے دواعی علی عباس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ لکھنا اور پڑھنا ان کی زیست تھی اور حاصلِ زیست بھی۔

خانگی خطوط کی خاص اہمیت یہ ہے کہ ان میں سید علی عباس کی زیست کے متنوع نقوش ہماری نظروں کے سامنے اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔ عام زندگی کے معاملات میں وہ کیسے سوچتے کیسے ردِ عمل دکھاتے؛ بیوی بچوں کے ساتھ وابستگی کیسی اور کس نوعیت کی تھی، اس کی مکمل تفاصیل اور اطلاعات یہ خطوط فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح عزیز و اقارب، ملازموں، ملازماؤں، دوست احباب، عام لوگوں، حتیٰ کہ پالتو جانوروں کے ساتھ ان کے رویوں کو بھی ان خطوط کی معرفت دیکھا جا سکتا ہے۔ خود علی عباس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مکاتیب ایک دن زیورِ طبع سے آراستہ ہوں گے، اس لیے انہوں نے جو قلم برداشتہ لکھا، اس میں اُن کی عام زندگی بلا کم و کاست در آئی ہے۔ اور اُن کی یہی عام زندگی ہمیں ایک عظیم دانشور کے ذہن کے نہاں خانوں اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے مختلف دریچے، منظر، پس منظر اور زینے فراہم کرتی ہے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے راقم الحروف پر منکشف ہوا کہ عظیم دانشور علی عباس اور ان کی عام زندگی میں کوئی تضاد نہیں۔ علم، دانش اور لکھنے کے حوالے سے انہوں نے جو اصول مرتب کر رکھے تھے، زندگی کے عام معاملات اور طرزِ عمل میں بھی انہی اصولوں کی کارفرمائی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

دوست احباب، ادبا و شعرا، جاننے والوں، علی عباس کی فکر اور نظریات سے متاثر نوجوانوں اور پبلشرز وغیرہ کو تحریر کیے گئے خطوط میں جابجا ان کے نظریات و افکار نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں کے نام لکھے گئے خطوط میں بیماری کے باوجود ان کے جذبے کی چمک ماند نہیں پڑی اور انہوں نے کھل کر ترقی پسندی، خرد افروزی، انقلابیت، اشتراکیت اور مارکسزم سے اپنی وابستگی کو ظاہر کیا ہے اور نوجوانوں کو سماجی تبدیلی کے عمل میں شریک ہونے، انقلاب کا پرچم تھامنے، خرد افروزی کے رجحانات کو فروغ دینے اور قدامت پرستی کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

خانگی خطوط کے برعکس احباب وغیرہ کے نام تحریر کردہ خطوط میں اپنی بیماری (فالج) اور دائیں ہاتھ کے رعشہ کے بار بار ذکر کی وجہ یہ تھی کہ لالہ رُخ اور دیگر بچوں کی عدم موجودگی میں وہ خطوط تحریر نہیں کر سکتے تھے اس لیے جواب دینے میں بعض اوقات تاخیر ہو جاتی اور موقع ملنے پر جواب تحریر کراتے تو تاخیر کی معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ بیماری کا بھی تذکرہ کر دیتے تاکہ حقیقی عذر مکتوب الیہ تک پہنچ پائے۔

علی عباس جلالپوری کے خطوط کی نثر میں ہمواری، قطعیت، توازن، لسانی و علمی معیار کی کارفرمائی دراصل ان کے منظم ذہن اور شخصیت ہی کی غماز ہے۔ وہ شدید ناراضگی اور گلہ میں بھی وقار، تحمل اور عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ احمد ندیم قاسمی اور آغا امیر حسین کے نام تحریر کیے گئے خطوط میں اس صورت حال کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان مکاتیب میں کہیں کہیں شگفتگی اور مزاح کے مرقعے بھی ملتے ہیں۔ گاہے گاہے اشعار کے برمحل استعمال اور خوبصورت علامتوں کی تخلیق نے نثر میں تخلیق کی شان پیدا کردی ہے۔

مکاتیب پر ایک نظر: اولین مکتوب لالہ رُخ کی والدہ کا ہے، جنہیں آخری عمر میں کینسر کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور وہ چیک اپ کے سلسلہ میں راولپنڈی میں اپنی بڑی بیٹی گل شگفتہ کے ہاں مقیم تھیں۔ یہ مکتوب لالہ رُخ کے نام ہے۔ بیماری کے باوجود انہوں نے تمام افرادِ خانہ، حتیٰ کہ طوطے کا بھی ذکر کیا ہے۔ خط کی خاص خصوصیت اس کی شگفتہ بیانی ہے۔ خالہ کو بچے کس طرح یاد کرتے ہیں، اس کی بابت اطلاع مزاحیہ انداز سے فراہم کی ہے: ''وہ سب لوگ تم کو بہت یاد کرتے ہیں کہ خالہ ہمارے ہاں نہیں آئے گی یا وہ اب ملازمت چھوڑ چکی ہے۔ لڑکیوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ جب مس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ نوکری چھوڑ دیتی ہے خاصا مذاق رہا۔''[1]

شہزادی بیگم کے نام خطوط: بیگم کے نام علی عباس کے خطوط بوچھال کلاں، ڈنگہ، چکوال، ملتان، گوجرانوالہ اور لاہور سے ارسال کیے گئے۔ ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بیگم کا فکر بہت دامن گیر ہے۔ وہ بیگم کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں، تاہم معروضی حالات کے اپنے تقاضے ہیں، جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بیگم صاحبہ نفیس اور منفرد شخصیت کی حامل تھیں۔ اخبارات و رسائل کا مطالعہ فرماتی اور ٹی۔ وی پر نشر ہونے والے ڈرامے دیکھتیں۔ بعض اوقات ایسے فیصلے بھی کر جاتیں جو شوہر نامدار کو ناگوار گزرتے۔ بیگم کے ساتھ علی عباس کی زندگی ہموار سطح پر نہیں گزری۔ ایک مرتبہ وہ اپنی والدہ کے ہاں ہفتہ عشرہ کے لیے ڈنگہ گئے تو بیگم نے انہیں تار ارسال کردیا، جس کے جواب میں انہوں نے لکھا: ''تار دینے کی ضرورت نہیں تھی، خط لکھ دیا ہوتا۔''[2] سید صاحب کو بسلسلۂ ملازمت کئی شہروں اور علاقوں میں رہنا پڑا۔ وہ جہاں جاتے ان کی کوشش ہوتی کہ اچھا مکان اگر کرائے پر مل جائے تو بیگم اور بچوں کو بھی بلا لیا جائے لیکن بیشتر اوقات جو مکان ملے، وہ اس قابل نہیں تھے کہ نفیس الطبع بیگم صاحبہ ان میں رہائش پذیر ہوسکتیں۔ کئی جگہوں پر جیسے

1۔ شہزادی بیگم، مکتوب بنام لالہ رُخ، راولپنڈی، ۱۴۔ اگست ۱۹۹۳ء۔

2۔ علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، بوچھال کلاں، ۸۔ جون ۱۹۵۳ء۔

گوجرانوالہ، لاہور بیگم اور بچے ان کے ساتھ بھی رہے۔ اگر بیگم جلال پور شریف یا میکے میں مقیم ہوتیں تو انہیں باقاعدگی سے سو روپیہ ماہوار خرچہ ارسال فرماتے۔ کبھی کبھار کسی کے ہاتھ زائد خرچہ بھجوا دیتے۔ ایک بار خط میں دس روپے کا نوٹ ملفوف کر کے بھیج دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ خط ڈاکیے نے غائب کر دیا: ''حیرت ہے تمہیں وہ خط کیوں نہیں ملا۔ میرا خیال ہے جس کو دس روپے کا نوٹ ملا ہے اس کے منہ لہو لگ گیا ہے اور اب وہ میرے ہر خط میں نوٹ کی تلاش کرتا ہے۔''[1]

بیگم صاحبہ دھڑلے کی خاتون تھیں اور سچ بات دوسروں کے منہ پر کہہ دیتیں۔ طاقتور شخصیت ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بالادست حیثیت کو بھی بروئے کار لانے سے گریز نہ کرتیں۔

علی عباس اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ ملازموں، ملازماؤں اور اہلِ محلّہ کا بھی بہت خیال رکھتے: ''عید پر کمیوں کو ایک ایک روپیہ اور روٹی دینا''[2] ؛ ''اس (اینہ) کا کوئی کپڑا پھٹ گیا ہو تو لے دینا''[3] ؛ ''بوڑھی نوکرانی کو پانچ روپیہ ماہوار دینا کر لو یا اس سے زیادہ جو مناسب ہو۔ کپڑے بھی لے دینا۔''[4] ملتان میں مقیم تھے کہ بیگم کے خط کی معرفت پتہ چلا کہ پڑوس کے کمہاروں کے ہاں چوری ہو گئی۔ تھانے میں علی عباس کی معرفت ایف۔ آئی۔ آر درج کروائی گئی۔ ایک آدھ خط میں بھی انہوں نے اس ضمن میں بیگم سے استفسار کیا کہ تفتیش کا کیا بنا، اور جب پتہ چلا کہ چوری کا سراغ لگ گیا ہے تو خوشی کا اظہار کیا۔

گھر کے مکینوں کی طرح انہیں اپنے آبائی مکان (واقع جلالپور شریف) سے بھی بہت اُنس تھا۔ لگتا ہے وہ گھر کی ایک ایک اینٹ سے آگاہ تھے اور خبر تھی کہ گھر کے کس حصہ کی تعمیرِ نو کی ضرورت ہے۔

خطوط میں جہاں جہاں بچوں کا ذکر آیا ہے، ان کے نام کی مناسبت سے سلمہ یا سلمہا کا لاحقہ ضرور لگایا ہے۔ بیگم کے نام لکھے گئے کم و بیش تمام خطوط میں بچوں کا ذکر ہے۔ ایمرسن کالج ملتان میں تعینات تھے تو حامد رضا ان کے پاس تھے۔ خطوط کے ذریعے حامد رضا کے پل پل کی خبر بیگم کو پہنچا رہے ہیں۔ حامد کو کالی کھانسی کی شکایت ہوئی تو لکھا: ''راتیں عموماً جاگ کر گزارتے ہیں۔ دن کو آرام رہتا ہے لیکن جب رات کو کھانسی شروع ہوتی ہے تو بڑی تکلیف رہتی ہے۔ بے چارے کا سانس اُکھڑ اُکھڑ جاتا ہے۔ میں اسے گود میں لیے بیٹھا رہتا ہوں۔''[5] بچے والدہ کے پاس رہ رہے ہوتے تو ان کی پڑھائی کی طرف رہ رہ کر ان

---

[1] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، مقام و تاریخ ندارد۔ [2] علی عباس جلالپوری، علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، بوچھال کلاں، ۸۔ جون ۱۹۵۳ء۔ [3] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، مقام و تاریخ ندارد۔ [4] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، ملتان، سنہ ندارد۔ [5] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، مقام و تاریخ ندارد۔

کا خیال جاتا۔

ایم۔اے اُردو کے پرچے دینے کے دوران میں لالہ رُخ لاہور میں پروفیسر ظفر علی خان کے ہاں مقیم رہیں۔ پرچوں کی بابت علی عباس نے بیگم کو اطلاع کی "آج بخاری کا چوتھا پرچہ ہے۔اس کی حالت عجیب ہے۔ پرچہ دینے سے پہلے پریشان ہوجاتی ہے۔۔ لیکن حل کرنے کے بعد ہال سے باہر نکلتی ہے تو بڑی خوش ہوتی ہے کہ پرچہ اچھا ہوگیا ہے۔۔ میں اُسے پڑھانے سے زیادہ اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہتا ہوں کہ خدا کرے اس کی محنت ثمر آور ہو۔" [1]

بیگم کے نام تحریر کردہ خطوط میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ ہیں جن میں مرغوں اور مرغیوں کا ذکر ہے۔علی عباس جن دنوں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں تعینات، اور ہوسٹل انچارج ہونے کی وجہ سے اس سے متصلہ رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ایک بار جلالپور شریف سے گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہوئے تو بیگم نے مرغوں اور مُرغیوں سے بھرا ٹوکرا ان کو تھما دیا۔ بعد کی تفصیل خود علی عباس کی زبانی سُنیے:۔

> "ہم لوگ بفضلہ بہ خیریت تمام یہاں پہنچ گئے ہیں۔تمہارے مرغوں نے البتہ خاصا پریشان کیا۔ پہلے تو بس کی چھت پر ٹوکرا رکھتے وقت دو مرغ بھاگ نکلے۔انہیں پکڑنے میں کئی آدمیوں نے دوڑیں لگائیں۔ بارے پکڑ دھکڑ کر پھر ٹوکرے میں ٹھونس دیے۔ بس ہرن پور پہنچی تو مرغا پھر اُچک کر بھاگ نکلا۔ فضل نے جوں توں اُسے پکڑا۔ رسیاں بہت بودی تھیں۔ انہیں بک کرانا بھی ایک مرحلہ تھا۔ بہر صورت وہ یہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئے ہیں اور تادمِ تحریر خوش ہیں۔ مرغے نے مرغیاں سنبھال لی ہیں۔" [2]

ایک خط میں مرغیوں مرغوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

---

[1] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، لاہور، ۲۷۔ مارچ ۱۹۸۴ء۔

[2] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، گوجرانوالہ، ۱۴۔ ستمبر ۱۹۶۵ء۔

''سنو'' قصہ مرغیوں کا'' سرخ چوزہ تو اسی دن شام کو قریب المرگ ہو گیا تھا۔ شفیع نے اسے ذبح کر کے کھایا۔ دوسرے دن سفید چوزہ کی حالت بھی غیر ہو گئی چنانچہ وہ بھی ذبح کر دیا گیا اور نوکروں کے دوزخِ شکم کا ایندھن بن گیا۔ لڑاکا چوزہ باقی رہ گیا ہے اور اسے ماں نے مارنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بے چارا اس کے آگے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ میں انہیں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کھلایا کرتا ہوں اور ہاں رُخی کی مرغیوں نے بھی انڈے دینا شروع کر دیئے۔ کل سُرخی نے غسل خانے میں گھس کر ایک بہت ہی ننھا سا انڈا دیا۔ سات آٹھ انڈے جمع ہو گئے تھے نوکروں کو دے دیئے ہیں کہ ان کی رکھوالی بھی وہی کرتے ہیں۔ باقی مرغیاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ چوزوں والی مرغی اب خوب ٹھنی گئی ہو گئی ہے اور پر پُرزے نکال رہی ہے۔''[1]

حامد رضا کے نام خطوط:

حامد رضا کے نام لکھے گئے خطوط میں کچھ معلومات تو بیگم کے نام تحریر کیے گئے خطوط والی ہیں، جیسے جلالپور شریف میں مکان کی مرمت وغیرہ کا کام۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں بورڈ کے پرچوں کی مارکنگ کے حوالے سے ہیڈ تھے، اور وہ یہ کام نمٹا کر ہی گوجرانوالہ سے جلالپور شریف جانا چاہتے تھے کیونکہ ''تین چار سو روپے کا چکر''[2] تھا۔ یہ بات بیگم کے نام ایک خط میں بھی کہہ چکے تھے۔ ایک خط میں راجہ افضل (لالہ رُخ کی دوست فرحت راجہ کے خالو) کے آنے کی اطلاع کی ہے۔ جعفر رضا (حامد رضا کے برادرِ خورد) کی آمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''جعفر کو تم لوگوں نے جلاوطن کر دیا ہے۔ کل وہ اچانک آن وارد ہوا تو میں ہکا بکا رہ گیا کہ کیا افتاد پڑی۔ اسی وقت راجہ افضل خاں (چک جانی) بھی آ گئے۔ اُن کی زبانی احوال معلوم ہوا۔

---

1. علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام شہزادی بیگم، گوجرانوالہ، ۳۔ جون ۱۹۶۶ء۔
2. علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام حامد رضا، گوجرانوالہ، ۱۳۔ جولائی ۱۹۶۶ء۔

بہر صورت اُس کے آجانے سے ایک فائدہ ہوگیا ہے۔ اُس نے اِدھر اُدھر سے آٹھ انڈے ڈھونڈ نکالے ہیں جن پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی اور مرغیوں پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر دی ہے۔ میرے لیے تو وہ دردِ سر بن گئی تھیں۔ میں بار ہنکاتا ہوں تو پھر آگھستی ہیں اور چیخ پکار سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کل سے مرغی خانہ جعفر کے حوالہ کر دیا ہے۔'' [1]

ایک نوجوان کی شادی میں رکاوٹ پڑی تو حامد کو مزاحیہ انداز میں لکھا: ''دراصل اس کی شادی کے ستارے شروع سے گردش میں ہیں۔ کسی پیر صاحب کو شیرینی دے گا تو بات بنے گی'' [2]

حامد رضا نے خط میں روزنامہ ''امروز'' کے موصول ہونے کی اطلاع کی تو جواب میں لکھا:۔

''یہ اچھا ہوا کہ اخبار لگ گیا ہے۔ بین الاقوامی حالات خاصے خدشہ ناک ہو گئے ہیں۔ امریکی جرائم پیشہ امنِ عالم کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ماسٹر خدا بخش کو میں نے شیعہ نہیں کیا۔ میں نے تو محض انہیں مرشدِ کامل کا پتہ بتایا تھا۔ میں خود شیعہ سنی کے چکر سے بالاتر ہوں۔ بہر حال جو انہوں نے کیا ہے اُن کے اپنے عقیدے کے مطابق درست ہے۔ سنی شیعہ کی تفریق غیر ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت انسان ہونے کے کوئی کیسا ہے۔'' [3]

پروفیسر حامد رضا کا اپنے والدِ گرامی کے نام لکھا ہوا ایک خط بھی پروفیسر لالہ رُخ نے شاملِ اشاعت کیا ہے، جس میں اپنے ہاں بیٹے کی ولادت کی اطلاع کے بعد لکھا ہے'' بچے کا رنگ فی الحال بہت گورا ہے۔ ناک پھینی اور آنکھیں تو بہ مشکل سے کھلتی ہیں۔ بالکل آپ جیسی ہیں۔۔'' [4]

---

[1] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام حامد رضا، گوجرانوالہ، ۱۳۔ جولائی ۱۹۶۶ء۔

[2] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام حامد رضا، گوجرانوالہ، سنہ ندارد۔

[3] علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام حامد رضا، گوجرانوالہ، ۲۳۔ جولائی ۱۹۶۶ء۔

[4] حامد رضا، مکتوب بنام علی عباس جلالپوری، جہلم، ۵۔ مئی ۱۹۸۴ء۔

جعفر رضا کے نام خطوط: ان میں مکان کی مرمت، جعفر کی والدہ کی علالت، بناسپتی گھی کی نایابی جعفر کی میٹرک کے امتحان میں کامیابی کا ذکر ہے۔ ایک خط میں جعفر رضا کے خط کی تحریر پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''تم تو چھپے ہوئے ادیب ہو۔ البتہ ایک چُوک تم سے ہوگئی۔ بہر حال کو بحر حال لکھ دیا یہ لفظ ''بہ ہر حال'' (ہر حال میں) ہے۔ بحر تو سمندر کو کہتے ہیں ناں۔''[1]

لالہ رُخ کے نام خطوط: ان مکاتیب میں لالہ رُخ کے تفصیلی حالات کے ساتھ ساتھ خود علی عباس کے معاملاتِ زیست، بیگم اور بچوں کے علاوہ کئی دیگر پہلوؤں کی تفاصیل بھی آ گئی ہیں۔ ان خطوط کا دورانیہ کم و بیش ساڑھے دس سال (۲۲۔ جولائی ۱۹۷۶ء تا ۱۵۔ دسمبر ۱۹۸۶ء) پر محیط ہے۔ ان خطوط سے باپ کی بیٹی کے ساتھ شدید وابستگی، شفقت، محبت اور بیٹی کی باپ سے والہانہ شیفتگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شہزادی بیگم، حامد رضا، جعفر رضا کے نام خطوط سے بخوبی عیاں ہے کہ علی عباس بچوں کی تعلیم و تربیت پر گہری توجہ مبذول کیے ہوئے ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں تو بار باران کی والدہ کو ہر ایک بچے کے حوالے سے مشورے دیتے ہیں، بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو اس کی عمر اور ذہن کی مناسبت سے اس سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔ لالہ رُخ کے نام جو نامے لکھے ان کا بیشتر حصہ لالہ رُخ کی تعلیم، ذہنی رجحانات اور نمو پذیر شخصیت سے متعلق ہے۔

انگریزی میں تحریر کردہ خط میں لالہ رُخ کی گھر سے گجرات روانگی (ان دنوں وہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین میں بی۔اے کی طالبہ تھیں، اور کالج کے ہوسٹل میں مقیم تھیں) پر اپنی اور اہلِ خانہ کی آزردگی کے ساتھ ان کی تعلیم کے حوالے سے طمانیت کا بھی اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ زیست پھولوں کا گہوارہ نہیں، ہمت سے کام لے کر بدلے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔[2] جب لالہ رُخ نے انگریزی کے پرچے میں اچھی کارکردگی دکھائی تو لکھا: ''یہ معلوم کر کے اک گونہ

---

1. سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام جعفر رضا، لاہور، ۱۷۔ جولائی ۱۹۷۳ء۔

2. سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری، لاہور، ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء۔

مسرت ہوئی کہ عزیزہ نے انگریزی کے پرچے میں امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ مبارک باشد۔" ایک مکتوب میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کمرۂ امتحان میں سوالیہ پرچے کو پڑھنے اور جواب تحریر کرنے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہییں:۔

"پہلے پرچہ غور سے پڑھنا۔ پہلی نظر میں پرچہ عموماً مشکل محسوس ہوتا ہے۔ دوسری بار نگاہ ڈالنے سے اِشکال رفع ہو جاتا ہے۔ پھر اُس سوال کا جواب لکھنا جو تم بہت اچھی طرح کر سکتی ہو۔ اسی قسم کا ایک سوال آخر میں حل کرنا۔ تمام سوالوں کو مناسب وقت دینا ضروری ہے اور آخر میں ۵، ۶، ۷ منٹ دہرانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ تاریخ کا پرچہ عموماً طوالت طلب ہوتا ہے۔ اس لیے شروع ہی سے لکھنے کی رفتار تیز رکھنا انسب ہے۔ جوابات کے نمبر اور سرخیاں نمایاں ہوں۔ Points پرچہ دیکھنے والوں کو پہلی نظر ہی میں واضح ہو جانے چاہیں۔ خلط ملط نہیں ہونے چاہیں۔ کاپی پر حاشیہ لگانا اچھا لگتا ہے۔ سطریں سیدھی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پرچہ دیکھنے والے یا والی کو دیکھنے میں سہولت ہو اور اُسے Points تلاش نہ کرنا پڑیں۔ پرچے دیکھنے والے کا پہلا تاثر خوشگوار ہو تو وہ کھل کر نمبر دیتا ہے۔ اردو، فارسی کے پرچے میں خوشخطی کا ممکن حد تک خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ خوشخطی کا اہتمام کرتے ہوئے سوال ہی پورے نہ حل ہو سکیں۔ انگریزی کے پرچوں میں Spelling اور Tense کی اغلاط نہیں ہونی چاہئیں۔

سب سے آخر میں سب سے ضروری۔ پرچہ مگن ہو کر لکھو۔ نہ کسی کو کچھ بتاؤ نہ کسی سے کچھ پوچھو۔ اس طرح اپنے آپ پر اعتماد مجروح ہو جاتا ہے اور پورے اعتماد سے پرچہ لکھو۔ گھبراہٹ اور بے چینی رکاوٹ بن جاتی ہے اور Good Luck!

جیسا کہ میں نے زبانی کہا تھا۔ رات کو زیادہ دیر تک نہ
جاگنا۔ صبح کو جو پرچہ ہو اُس پر ایک دو بار سرسری نگاہ ڈال لی۔
یہی کافی ہوتا ہے۔"[1]

لالہ رُخ کی اشاعت پذیر ہونے والی اوّلین نظم کی بابت اطلاع یوں کی: "تمہاری نظم" لمحے " اگست (۱۹۸۳ء) کے "محفل" میں چھپ گئی ہے۔ تم پہلی بار اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔"[2] ساتھ ہی یہ بھی نوید سنائی کہ مزید دو نظمیں "فنون" میں اشاعت کے لیے بھیج دیں گے۔ علی عباس چاہتے تھے کہ اُن کی بیٹی کا شمار خواتین شعرا میں ہونے لگے اور وہ نامور ہو جائے۔ اسی خط سے یہ بھی عندیہ مل رہا ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ لالہ رُخ افسانہ نگاری بھی شروع کر چکی ہیں: "تمہارے امتحان کے بعد تمہارے افسانے بھی چھپنا شروع ہو جائیں گے۔"[3]

گورنمنٹ کالج ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لالہ رُخ کی بطور لیکچرار تعیناتی ہوئی تو مشورہ دیا کہ اگر زیادہ بولنے کی وجہ سے گلے میں خراش ہو تو Strepsils کی گولیاں استعمال کرو۔ ایک لیکچرار کے لیے ضروری ہے کہ گلے کا خیال رکھے۔ ساتھ ہی یہ بھی گُر بتا رہے ہیں کہ لڑکیوں کو عموماً گھر میں ہمدردی اور توجہ نہیں ملتی۔ "اگر تمہارا رویہ مروّت کا ہوا تو وہ مطمئن رہیں گی اور تمہارے لیکچر کو غور سے سنیں گی۔"[4]

لالہ رُخ کے نام تحریر کردہ خطوط کا اہم پہلو یہ ہے کہ علی عباس جلالپوری بیٹی کی تعلیمی، علمی، ادبی سرگرمیوں، نمو پذیر ذہنی رجحانات، اور اس کی شخصیت کے جوہر اور اس کی امکانی استعداد سے پوری طرح آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سارے ہمہ گیر عمل میں رجحان ساز عامل کی حیثیت سے برابر کارفرما رہے۔

ان خطوط میں کہیں کہیں اہلِ خانہ اور ان کی سرگرمیوں، عزیز و اقارب اور احباب سے متعلق معلومات بھی فراہم ہو گئی ہیں۔ لالہ رُخ کے نام کچھ ایسے بھی خطوط ہیں، جن سے خود علی عباس کی زندگی کے کچھ

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بُخاری، جلالپور شریف ضلع جہلم، یکم ستمبر ۱۹۸۰ء۔
[2] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بُخاری، جلالپور شریف ضلع جہلم، ۲۵۔ اگست ۱۹۸۳ء۔
[3] ایضاً
[4] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بُخاری، جلالپور شریف ضلع جہلم، ۱۳۔ مارچ ۱۹۸۶ء۔

گوشے بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور سے اپنے آبائی علاقہ جلال پور شریف گئے تو لالہ رُخ کے نام خط میں تحریر کیا:۔

> "ہم لوگ بفضلہٖ کل بخیر و عافیت جلال پور شریف پہنچ گئے۔ ٹرک کا انتظام تمہارے بھائی جان نے کیا تھا۔ وہ علی الصباح ٹرک لے کر لاہور پہنچے اور وہاں سے ایک بجے بعد دوپہر عازمِ وطن ہوئے۔ میں اور تمہاری امی بس پکڑ کر شام کو پہنچ گئے۔ سامان بحفاظت تمام یہاں آ گیا اور کسی چیز کا نقصان نہیں ہوا۔ اس طرح یہ کٹھن مرحلہ بحسن و خوبی طے ہو گیا اور میں ۳۳ برس کی جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنے آبائی گاؤں آیا۔
>
> پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
>
> یہاں کا موسم بہت اچھا اور صحت پرور ہے۔ روشنی اور صاف ہوا اور صحت بخش پانی میسر ہے۔ مجھے لاہور سے آنے کا بالکل ملال نہیں ہوا البتہ محمد منیر بھٹی صاحب اور نجمہ نے جس محبت اور خلوص سے ہمیں رُخصت کیا اس سے طبیعت افسردہ ہو گئی اچھے لوگوں سے بچھڑنے کا غم تو ہوتا ہی ہے۔ خدا اُنھیں خوش رکھے۔"[1]

جلالپور والے گھر میں علی عباس اوپر کی منزل میں رہتے، جبکہ بیگم نے نچلی منزل سنبھال رکھی تھی۔ غالب کی طرح غالباً سید صاحب بھی بیگم کے حوالے سے تنہائی کا شکار تھے: "میں اور تمہاری امی دو ہونے کے باوجود یہاں اکیلے رہ گئے ہیں۔ اتنے بڑے مکان میں دونوں کا "اکیلا" رہنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن تنہائی انسان کا مقدر ہے۔ رونقیں عارضی ہوتی ہیں۔ تنہائی مستقلاً اس کے ساتھ ہے۔"[2]

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری، جلالپور شریف ضلع جہلم ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء۔

[2] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری، جلالپور شریف ضلع جہلم ۲۴۔ مارچ ۱۹۸۰ء۔

ایک خط میں اپنی بیتی ہوئی زیست پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:-

''تمہارا خط ملا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم نے کلاسیں لینا شروع کر دی ہیں۔ مصروفیت میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ بیکاری میں طرح طرح کے وسوسے گھیر لیتے ہیں۔ میرا فکر نہ کیا کرو۔ میں بھرپور زندگی گزار چکا ہوں، بہت خوشیاں سمیٹی ہیں بہت غم کمائے ہیں۔ بہت حماقتیں کی ہیں لیکن میں پشیمان نہیں ہوں خوش ہوں۔ ترازو کا پلڑا خوشی کی طرف جھکتا ہے یہ کیا کم ہے۔

اے رفیقِ خیر اندیش میں نے عشقِ جاناں میں
یہ نہ دیکھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا''[1]

یہ ''عشقِ جاناں'' دراصل علم، فلسفے اور خرد افروزی کے ساتھ علی عباس جلالپوری کے عشق ہی کا دوسرا نام ہے، جس کا حاصل عظیم کو کرتے کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہو رہا ہے۔

سیّد مراد علی شاہ پروفیسر لالہ رُخ بخاری کے خسر ہیں، ان کے بیٹے سیّد اعجاز علی بخاری کے ساتھ لالہ رُخ کی نسبت طے ہو گئی تو منگنی کی رسم کی ادائیگی کے لیے خط میں انہیں ۱۶۔نومبر ۱۹۹۰ء کے روز آنے کا دن دیا۔ بعد ازاں ۹۔فروری ۱۹۹۱ء کے مرقومہ خط میں ۲۲۔فروری ۱۹۹۱ء کو شادی کے لیے تاریخ مقرر کی، تاہم سیّد مراد علی شاہ کی والدہ کے انتقال کی وجہ سے یہ تاریخ ملتوی ہو گئی۔ بعد ازاں ۱۰۔اپریل ۱۹۹۱ء کو یہ شادی انجام پائی۔

ادبا و شعرا اور دوست احباب وغیرہ کے نام خطوط:

جگتار سنگھ کے نام پنجابی خط میں لکھتے ہیں کہ: ''پنجابی ادبی بورڈ'' سے سبط الحسن ضیغم نے بذریعہ خط اطلاع کی ہے کہ آپ میری کتاب ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' گورمکھی میں چھاپ رہے ہیں۔ علی عباس نے کتاب میں رہ جانے والی کچھ اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا کہ ان کی درستی کرالیں۔ خط کی تحریر کے یہ جملے پنجابی نثر کا خوبصورت نمونہ ہیں: ''ہوروی کوئی غلطی رہ گئی ہووے تے

---

[1] سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری، جہلم، ۱۰۔اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

اونوں درست کر دیناں۔ بندہ بھلن ہارا اے کچا ڈو جے پیتا ہویوس۔[1] خط سے نشان دہی ہوتی ہے کہ سیّد صاحب پنجابی ڈکشنری پر کام کر رہے تھے۔ پروفیسر لالہ رُخ نے راقم الحروف کے استفسار پر بتایا کہ یہ کام نامکمل رہ گیا۔

احمد ندیم قاسمی: ''فنون'' میں شائع ہونے والے خط میں کرار نوری کے نو اشعار جو علی عباس کو پسند آئے ،رقم کیے ہیں۔ان اشعار کا انتخاب ان کے ذوقِ جمال کا آئینہ دار ہے۔۱۹۸۹ء میں محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت نے انہیں ایوارڈ سے نوازا۔قبل ازیں وہ اپنی کتاب ''مقاماتِ وارث شاہ'' پر'' آدم جی انعام'' وصول کرنے سے انکار کر چکے تھے۔انہوں نے بینظیر بھٹو کی جانب سے دیے جانے والے ایوارڈ کو کیوں قبول کیا،اس کی بابت لکھتے ہیں: ''میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ فلسفے کو مستقل بالذات حیثیت دی گئی ہے۔''[2] اس جملے کے بعد کی تحریر بھی بہت اہم ہے اس لیے اسے یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا:۔

''غزالی سے لے کر اقبال تک ہمارے اہلِ علم نے فلسفے اور سائنس کو مذہب کی غلامی میں دے دیا اور عقلیت کو وجدان پر قربان کر دیا۔

آج سے بیس برس پہلے میرا ایک مضمون ''دنیائے اسلام میں خرد افروزی'' شائع ہوا تھا جس میں خرد افروزی اور عقلیت پسندی کی دعوت دی گئی تھی۔ خرد افروزی کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مجلسوں میں عقلی و تحقیقی علوم سے اعتنا کرنا عملاً ممنوع سمجھا گیا۔ آج کل اسلامی فلسفہ اور اسلامی سائنس کا عام چرچا ہے لیکن کسی اہلِ علم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اسلامی فلسفہ اور اسلامی سائنس کا مطلب کیا ہے۔عقلیت پسندی کو ہمارے دینی دانش وروں نے تاویلات کے وسیلے سے پامال کر دیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ فہد نے برملا یہ کہا کہ اہلِ

---

[1] علی عباس جلالپوری،مکتوب بنام جگتار سنگھ،جلالپور شریف،ضلع جہلم، ۱۷۔اگست ۱۹۸۰ء۔

[2] علی عباس جلالپوری،مکتوب بنام احمد ندیم قاسمی،جہلم، ۱۲۔دسمبر ۱۹۸۹ء۔

مغرب سائنس میں ایجادات کرتے ہیں جبکہ ہم نے روحانیت
کے میدان میں زبردست ایجادات کی ہیں۔ یہ بات ایک ایسا
شخص ہی کہہ سکتا تھا جو علوم جدیدہ سے بے بہرہ ہو۔ لوگ میری
فکر کو خاموشی کی سازش سے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔
یہ دیکھ کر اطمینان ہوا ہے کہ بعض ذہین نوجوانوں نے میری
دعوت کو قبول کر لیا ہے چنانچہ اس ایوارڈ کی صورت میں فلسفے کے
حقیقی مقام کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک بات خاص طور سے میرے
لیے اطمینان کا باعث ہے کہ یہ ایوارڈ فلسفے کو دیا گیا ہے۔'' [1]

دراصل خرد افروزی کا فلسفہ علی عباس جلالپوری کی پوری فکر کا اصل الاصول ہے۔ وہ عمر بھر کسی قیمت پر بھی اس سے دستبردار نہ ہوئے۔

ایک مکتوب میں ''فنون'' کا تازہ شمارہ موصول ہونے پر احمد ندیم قاسمی کا شکریہ ادا کیا ہے اور اپنے دائیں ہاتھ میں رعشہ کے سبب لکھنے کی معذوری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ یہ خط لالہ رُخ سے لکھوا رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی ہے کہ لالہ رُخ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہے اور تقرری کے احکامات کی منتظر ہے۔ [2]

ایک خط سے عندیہ مل رہا ہے کہ علی عباس جلالپوری احمد ندیم قاسمی سے اور احمد ندیم قاسمی علی عباس سے ناراض ہیں: ''آج سے دو سال پہلے مکتوبہ بھیجنے کا آپ نے پکا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کسی دن خود اسے لینے آئیں گے۔'' [3] مگر قاسمی صاحب نے وعدہ کے مطابق نہ تو مکتوبہ ارسال کیا اور نہ ہی خود لے کر پہنچے، انہیں شکایت ہے کہ اگر مکتوبہ مل جاتا تو ''اب تک کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ چکا ہوتا۔ اب مجھے نئے سرے سے ترددکرنا پڑے گا۔'' [4] یہ دراصل ''اقبال کا علم کلام'' کا مسودہ تھا۔ دوسری جانب قاسمی صاحب اس لیے ناراض ہیں کہ علی عباس نے کاظم (سید محمد کاظم) صاحب سے مسودہ کے حوالے سے

---

1. سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام احمد ندیم قاسمی، جہلم، ۱۲۔ دسمبر ۱۹۸۹ء
2. سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام احمد ندیم قاسمی، جہلم، ۵۔ جنوری ۱۹۸۶ء۔
3. سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام احمد ندیم قاسمی، جہلم، ۱۳۔ جون ۱۹۸۶ء۔
4. ایضاً۔

شکایت کیوں کی۔

اگلے خط سے پتہ چل رہا ہے کہ جلالپوری اور قاسمی کے مابین اب شکر رنجی کی کیفیت ختم ہوگئی ہے۔ ایک موقع پر خط میں ڈھائی جملوں کی ایسی ساخت بندی ہے کہ اس میں جہانِ معنی سمٹ آیا ہے:۔''سید محمد کاظم صاحب کا خط پڑھ کر میں بڑا محظوظ ہوا۔ انہوں نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے کے ساتھ تعریف و تحسین کا چارہ لگا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ایک آدھ مچھلی اُسے نگل جائے گی اور اُن کے شالامار میں چہل قدمی کرنے کا کوئی نہ کوئی عنوان بن جائے گا۔''[1]

سیّد سبط الحسن ضیغم: لالہ رُخ سے لکھوائے ہوئے اس خط کی پوری عبارت دلنشیں اور خوبصورت ہے۔ خط کے یہ الفاظ: ''سجن جی وسدے رہو''[2] اپنے اندر کتنی کہکشائیں سمیٹے ہوئے ہے!

مشتاق احمد: مشتاق احمد کے نام لکھے ہوئے چار خطوط سے علم ہوتا ہے کہ وہ متجسس اور ذہنِ رسا کے حامل ایسے نوجوان تھے، جو جلالپوری صاحب کی خرد افروزی کی تحریک سے متاثر، ان کی کتب پڑھنے کے جویا اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کے شعری مجموعہ ''دشتِ نوا'' کے بارے میں علی عباس نے یہ رائے دی:

> ''دشتِ نوا'' مل گئی ہے۔ میں نے اسے غور سے پڑھا۔ مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ آپ کے ہاں حُسنِ تغزل کے ساتھ شعورِ عصر اور انقلابیت کے بھی واضح نشان ملتے ہیں جو آج کل کے اہمال اور ابہام کے زمانے میں یقیناً میرے جیسے لوگوں کے لیے تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ آج کل شاعری کے مدعی تو بہت ہیں لیکن میرے خیال میں ان میں اکثر متشاعر اور تنگ بند ہیں۔ ان میں ترقی پسندی اور انقلابیت کے عناصر بھی کم ہی ملتے ہیں۔ ان حالات میں آپ کا کلام اہلِ نظر کو متاثر کرے گا جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہیں کہیں عروض کی خامیاں بھی ہیں لیکن مشق جاری رہی تو یہ از خود دور ہو جائیں گی۔ آپ کے کلام پر

---

1. سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام احمد ندیم قاسمی، جہلم، ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء۔
2. سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام سید سبط الحسن ضیغم، جہلم، ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔

تبصرے بھی دیکھے جو مجھے سطحی اور سرسری لگے۔ آپ کے کلام
کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ''دشتِ نوا'' میں مندرجہ ذیل
اشعار مجھے خاص طور پر اچھے لگے۔ ان میں مجھے فکر کی تازگی اور
بیان کی شگفتگی کے آثار دکھائی دیئے۔'' [1]

منقولہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ علی عباس جلالپوری کھلے دل کے ساتھ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ مشتاق احمد کی شاعری نے متاثر کیا تو یہاں تک لکھ دیا: ''میں نے اسے غور سے پڑھا۔ مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔'' [2] اقتباس کی آخری لائنوں سے پتہ چل رہا ہے کہ مشتاق احمد کی شاعری کی تعریف محض ایک نوجوان کی حوصلہ افزائی کے زمرے میں نہیں آتی۔

زیرِ نظر اقتباس سے فنِ شاعری کے حوالے سے خود جلالپوری صاحب کا نقطۂ نظر بھی نمایاں ہوا ہے۔ ''ترقی پسندی''، ''انقلابیت''، ''بیان کی شگفتگی'' جیسے الفاظ وتراکیب سماجی تبدیلی سے وابستگی کی حامل فکر کے ساتھ ساتھ اُسلوب بیان میں تازہ کاری کے بھی غماز ہیں۔ جہاں تک ''اجمال'' اور ابہام کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مطلقاً ان کے مخالف تھے۔ دراصل شاعری یا فن میں وہ معنی کی پائپ لائن کی ریزگی کے بجائے برقراری کے حامی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اجمال اور ابہام کی آمیزش سے ایسی تجرید اُبھر سکتی ہے جو معنی کی پائپ لائن کو نابود کر کے فن اور قاری کی مابین ابلاغ کا راستہ مسدود کر دے۔

مشتاق احمد نے علی عباس کو پڑھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک مضمون بھی ارسال کیا، جس کے جواب میں لکھا:۔

'' میں نے آپ کا مختصر سا مضمون غور سے پڑھا ہے۔
آپ نے درست کہا کہ خرد افروزی کے راستے میں مذہب ہی
سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن آج کل کے مذہبی جنون کے
دور میں کون اس بات کی تاب لا سکے گا۔ میری کتاب ''اقبال کا
علم کلام'' جس میں خرد افروزی کی دعوت دی گئی تھی، کے خلاف
جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس سے آپ شاید واقف نہیں ہیں۔

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام مشتاق احمد، جہلم، ٦۔ اگست ١٩٨٥ء۔

[2] ایضاً۔

آج کل تو ایسے مضامین پسند کیے جاتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا دل اسی میں مخفی ہے۔ اہلِ مغرب نے جو ترقی کی ہے وہ قرآن ہی کا فیضان ہے۔ سوشلزم پر خدا کا پیوند لگا دیا جائے تو وہ اسلام بن جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں سے لوگوں کے ذہن پراگندہ کیے جا رہے ہیں اور انہیں برتری کے زعم میں مبتلا کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگ حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے ہیں''۔[1]

ایک خط میں لکھا: ''ہم جہالت، ریاکاری اور جنون کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارا منصب ہے کہ خرد افروزی کی شمع روشن رکھیں۔'' ''فنون'' کے کچھ پرچوں کے بارے استفسار کے جواب میں تحریر کیا کہ: ''جن پرچوں میں میرے اور بشیر احمد ڈار مرحوم کے مابین مباحثہ ہوا تھا۔۔ میرے پاس وہ پرچے تھے لیکن ایک صاحب اُٹھا کر لے گئے اور واپس کرنے کی زحمت نہیں کی۔''[2]

گلباز آفاقی: گلباز آفاقی کا علی عباس جلالپوری کے بارے میں ''پاکستان ٹائمز'' میں شذرہ طبع ہوا اس میں جو معلومات فراہم کی گئیں، غالباً ان کا ماخذ ''میرے مکالمات'' مطبوعہ ''راوی'' تھا۔ ان الفاظ ''میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔ میں نے فشٹے کہا تھا آپ نے اسے نیٹشے سمجھ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماؤف ہونے کے باعث میری زبان آج کل صاف نہیں رہی۔''[3] سے یہ عندیہ مل رہا ہے کہ گلباز آفاقی کو سننے میں غلطی لگی۔ ''حافظہ کمزور ہو گیا ہے'' سے ہو سکتا ہے علی عباس کی یہ مراد ہو کہ نیٹشے کے بجائے فشٹے کا نام ان کے منہ سے نکل گیا۔ ''ماؤف ہونے کے باعث میری زبان آج کل صاف نہیں رہی'' سے اشتباہ پیدا ہو رہا ہے کہ وہ نیٹشے کہنا چاہ رہے تھے لیکن زبان کی لکنت (بوجہ فالج) کی وجہ سے یہ لفظ صحیح طور پر ادا نہ ہو سکا۔ بہر حال ان جملوں میں بذاتِ خود ابہام کی کیفیت ہے۔

---

[1] سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام مشتاق احمد، جہلم، ۶ نومبر ۱۹۸۵ء۔

[2] سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام مشتاق احمد، جلالپور شریف، ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء۔

[3] سیّد علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام گلباز آفاقی، جہلم، ۳۰۔ اپریل ۱۹۹۰ء۔

خط میں مذکورہ شذرے میں فراہم کی گئیں معلومات کے حوالے سے علی عباس جلالپوری نے چند توضیحات وتصریحات بھی کی ہیں۔گلباز آفاق نے لکھا ہوگا کہ علی عباس انسان کے جذباتی پہلو سے زیادہ اعتنا نہیں کرتے۔جواب میں جلالپوری صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات ''صرف ایک حد تک درست ہے۔''[1] وجدان کے بارے میں ان کا موقف ہے کہ یہ ''اپنے اظہار میں عقل وخرد کا محتاج ہے اور عقل وخرد کی برتری قائم کرنے کے لیے وجدان کو اپنے مقام پر رکھنا ضروری ہے۔''[2] اس کے ساتھ ساتھ ''میرے مکالمے'' میں پائی جانے والی آٹھ اغلاط کی نشان دہی بھی کی ہے،جن میں سے چند ایک یہ ہیں: گورنمنٹ کالج میں بطور طالب علم ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۵ء رہے،ٹیوٹر کا نام Heath تھا۔فیض احمد فیض سے تعلق اس وقت ہوا جب وہ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کے ایڈیٹر تھے۔پطرس نے اقبال سے کہا کہ آپ نے خودی کا فلسفہ نٹشے سے لیا،اقبال نے کہا کہ انہوں نے اسے مولانا روم اور قرآنِ مجید سے اخذ کیا ہے۔یہ حقیقی جواب نہ تھا، ''بلکہ صریح دھاندلی تھی۔''[3]

ایم۔سلیم: یہ خط ایم۔سلیم کی کتاب ''جدید فلکیات'' موصول ہونے پر تحریر ہوا۔اس کتاب کو قابلِ قدر علمی کاوش قرار دینے کے بعد سائنس اور فلسفے کے تعلق کے ضمن میں اپنے خیالات کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:۔

> ''آئن سٹائن کا نظریہ بھی میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔آج تک سائنس میں جتنے انکشافات ہوئے ہیں،میں نے انہیں فلسفے کے اصولوں کے ساتھ منسلک کر کے پڑھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔''[4]

نبیلہ: خطوط کا دورانیہ ۸۔ستمبر ۱۹۸۵ء تا ۲۰۔نومبر ۱۹۸۶ء تک ہے۔مشتاق احمد کے نام خطوط کے ضمن میں راقم الحروف نے بات کی تھی،یعنی علی عباس جلالپوری نوجوانوں کی جی بھر کے حوصلہ افزائی

---

[1] سید علی عباس جلالپوری،مکتوب بنام گلباز آفاق،جہلم،۳۰۔اپریل ۱۹۹۰ء۔

[2] ایضاً۔

[3] ایضاً۔

[4] سید علی عباس جلالپوری،مکتوب بنام ایم۔سلیم،جہلم،۱۷۔جون ۱۹۹۱ء۔

کرتے تھے، وہ زیرِ نظر خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ ان خطوط میں نبیلہ کو زندگی کی کڑی آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ دے رہے ہیں:۔

''تمہارا خط دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ تم اپنے دُکھ پر (نبیلہ اپنے والد کی وفات کی وجہ سے کافی عرصہ غم کی حالت میں رہی) ابھی تک قابو نہیں پا سکیں۔ قدرت نے چھوٹی سی عمر میں کیسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ہمت کرو۔ اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کرو۔ ابھی تمہارے سامنے زندگی کی طویل راہیں پڑی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن دلی خوشی سے ہم کنار ہو گی۔ بس رویا نہ کرو اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دن میں دو چار بار مسکرا لیا کرو اس سے طبیعت سنبھل جائے گی۔ دنیا حادثات کا گھر ہے۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہنے کا تاوان دینا ہی پڑتا ہے۔

مجھے دیکھو۔ فالج جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں۔ چلنے پھرنے سے قریب قریب معذور ہو چکا ہوں پھر بھی کسی نہ کسی کتاب کے چھپوانے کی فکر میں رہتا ہوں تاکہ اپنے مشن کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ تم بھی دلیری سے کام لو۔ ہار مان لینا ہمارے مسلک کا شیوہ نہیں ہے۔ شاباش اگلے خط میں مجھے بتانا کہ تم نے از سرِ نو ہمت اور استقلال کی کمر باندھ لی ہے۔''[1]

منقولہ بالا اقتباس میں ''مسلک'' سے مراد ترقی پسندی اور سوشلسٹ انقلاب کے نظریات ہیں، جن کی وضاحت اور نشان دہی نبیلہ کے نام خطوط سے بار بار ہو رہی ہے:۔

''ناامید ہونا اور ہراساں ہونا میرے مسلک کے خلاف ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہم لوگ جہالت، تعصب اور رجعت پسندی کے اتھاہ اندھیروں میں روشن خیالی اور عقلیت پسندی کی شمع جلائے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ موت کو ایک دن آنا ہی ہے۔

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام نبیلہ، جہلم، ۲۷ جولائی ۱۹۸۶ء۔

کیوں نہ زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کے لیے وقف کر دیا جائے مجھے اگر افسوس ہے تو یہی ہے کہ داہنے ہاتھ میں رعشہ ہو جانے کے باعث میں لکھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ یہ خط بھی اپنی بیٹی عزیزہ والا رُخ سے لکھوا رہا ہوں زمین دوز تاریکیوں میں کھو جانے سے پہلے ہم اپنا پرچم آپ جیسی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو دے جائیں گے جو اسے کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اُس صبح بہار کو ضرور دیکھیں گی جس کے لیے ہم لوگ خزاں کے تھپیڑے سہتے رہے ہیں اور کش مکش کرتے رہے ہیں۔ ۔۔لانگ مارچ کا کوئی سپاہی گولی کھا کر گرتا تو وہ اپنی سرخ ٹوپی اپنے کسی ساتھی کو دے کر کہتا، ''لو بھئی ہم تو چلے، تم اس کی لاج رکھنا''۔ یہی حالت ہماری ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ مرنے سے پہلے جو مشعل ہم آپ کو دے کر جائیں گے اُسے آپ زندگی بھر فروزاں رکھیں گی۔''[1]

وہ نبیلہ کو محمد اشرف جیسے ترقی پسندوں کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ اس نے سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کی کتب کا مطالعہ کیا ہو گا۔[2]

سٹالن، گاندھی، غدر پارٹی اور نہرو سے متعلق ایک خط میں نبیلہ نے سوالات اُٹھائے۔ سٹالن کے حوالے سے جواب دیتے ہوئے علی عباس جلالپوری نے لکھا:

''میں سٹالن کا کچھ زیادہ مداح نہیں ہوں۔ سٹالن نے لینن کی بیوی ''ترپسن کایا'' کی توہین کی تھی۔ لینن کے مرتے وقت جو وصیت لکھی تھی اس میں لکھا تھا کہ سٹالن اکھڑ اور درشت خو آدمی ہے جو اپنے خیالات سے اختلافات کرنے والوں سے انتقام لینے پر کمر بستہ رہتا ہے۔

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام نبیلہ، جہلم، ۸ ستمبر ۱۹۸۵ء۔

[2] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام نبیلہ، جلالپور شریف، ۸ جنوری ۱۹۸۶ء۔

بعد میں سٹالن نے لینن کے اس تجزیے کو سچ کر دکھایا اور
گورکی ہی نہیں کئی دوسرے اکابر پر بھی سخت تشدد کیا۔" [1]

منقولہ بالا اقتباس کے ان الفاظ" میں سٹالن کا کچھ زیادہ مداح نہیں ہوں" سے مترشح ہو رہا ہے کہ علی عباس سٹالن کے کچھ زیادہ مداح نہ سہی بہر طور مداح ضرور تھے۔ جہاں تک لینن کی بیوی کی تذلیل کا معاملہ ہے، تو اس کو دنیا کا کوئی بھی انقلابی دانشور مستحسن قرار نہیں دے گا۔ بہر حال اہم بات یہ ہے کہ اس ساری تحریر میں ٹراٹسکی کا نام تک نہیں آیا۔

زاہد: زاہد سے مراد غالباً اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی زبان و ادب کے استاد ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد ہیں۔ پنجابی زبان میں تحریر کردہ اس خط کا آغاز اس طرح ہوا ہے: "تہاڈے اتوں تلے دو چٹھیاں ملیاں نیں۔ مینوں بڑا افسوس اے بے چر کا جواب دے رہیا ہاں" [2] بعد میں کہتے ہیں کہ "تسی آو تاں چاہوتے پہلاں اطلاع کر دینا بئی کدوں تے کس ویلے آؤ سو۔" [3]

پروفیسر ظفر علی خان: علی عباس جلالپوری کے معتمد ساتھی۔ ان کی اہم ترین کتاب 'روایاتِ فلسفہ' اور کئی دیگر کتب پروفیسر ظفر علی خان نے شائع کرائیں۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" گوجرانوالہ کے زیرِ اہتمام علی عباس جلالپوری کے حوالے سے منعقدہ ایک اجلاس میں انہوں نے راقم الحروف کے سوال کے جواب میں جلالپوری صاحب کو علم کا سمندر قرار دیتے ہوئے ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

پروفیسر ظفر علی خان "اتحادِ اساتذہ" (بائیں بازو کے کالج اساتذہ کا فورم) کے چیئرمین اور ماہنامہ "اتحادِ اساتذہ" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کے نام یقیناً جلالپوری صاحب نے کئی خطوط تحریر کئے ہوں گے، پروفیسر لالہ رُخ بخاری کے ہاتھ محض ایک ہی خط لگا، جسے انہوں نے زیرِ نظر کتاب میں شامل کر دیا۔ یہ خط اگرچہ مختصر ہے، تاہم اس میں الفاظ کے دروبست نے خوبصورت فضا بندی پیدا کر دی ہے:

"عزیز حامد رضا کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ سے کوئی حادثہ
ہوا ہے اور گھٹنے پر سخت چوٹ آئی ہے۔ یہ پڑھ کر سخت افسوس

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام نبیلہ، جلالپور شریف، ۱۲ فروری ۱۹۸۶ء۔

[2] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام زاہد، ۸ ستمبر ۱۹۸۵ء۔

[3] ایضاً۔

ہوا۔ آپ جیسے سیلانی جہاں گرد کا گھٹنا زخمی ہو جانا اتنا ہی
افسوسناک ہے جتنا کہ میرے جیسے عادی لکھاری کا ہاتھ لکھنے سے
معذور ہو جانا۔

ہم سب کی دعا ہے کہ آپ کو جلدی صحت نصیب ہو اور بستر کی
قید سے رہائی ہو۔'' [1]

آغا امیر حسین: لاہور کے پبلشر اور ادارہ ''کلاسیک'' کے مالک آغا امیر حسین نے علی عباس جلالپوری کی کتاب'' تاریخ کا نیا موڑ'' شائع کی تھی'' لیکن مضامین کی کتاب (غالباً مقالات جلالپوری) شائع کرنے سے انکار کرتے ہوئے مسودہ واپس بھیج دیا۔ علی عباس اس کے ردِ عمل میں لکھتے ہیں:'' آپ نے میرے مضامین واپس کر دیے تھے۔ آپ کی مرضی۔ میں خود انہیں چھپوا لوں گا۔ آپ کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا کیونکہ یہ مضامین عام طور سے پسند کیے گئے تھے۔'' [2] بعد ازاں آغا نے'' تاریخ کا نیا موڑ'' کا جب دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی بار بار اجازت طلب کی تو تنگ آ کر یہ کہتے ہوئے اجازت دینے سے انکار کر دیا:''جس انداز میں آپ نے میرے مضامین کا مجموعہ واپس کر دیا تھا اس سے میری عزت نفس کی جراحت ہوئی تھی ۔۔ اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اپنی کتابیں خود ہی چھاپوں گا۔'' [3]

سید محمد کاظم: احمد ندیم قاسمی کا گلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:'' اقبال کا علم الکلام'' کی کتاب قاسمی صاحب دابے بیٹھے ہیں۔ انہیں کئی خط لکھ چکا ہوں لیکن ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔'' جیسے کہ گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے، یہ گلہ کاظم صاحب کی وساطت سے قاسمی صاحب تک پہنچا اور موصوف جلالپوری صاحب سے ناراض ہو گئے۔

اُن دنوں جلالپوری صاحب فالج کی بیماری کی وجہ سے شدید کرب اور تنہائی سے دو چار تھے:

'' آپ کا خط ملا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ میں عدم آباد پہنچ گیا
ہوں اور ڈاکیا فرشتہ اس جہانِ آب و گل سے میرا خط لے کر آیا
ہے۔ میں اپنی علالت کے بارے میں نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ کسی
سے اس کا تفصیل سے ذکر کرتا ہوں۔ زندگی کے اس آخری

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام ظفر علی خان، جلالپور شریف، ۸ جنوری ۱۹۸۶ء۔
[2] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام آغا امیر حسین، جلالپور شریف، ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء۔
[3] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام آغا امیر حسین، جہلم، ۵ جولائی ۱۹۸۶ء۔

مرحلے میں بس یہی خیال بار بار آتا ہے کہ چپکے سے آغوشِ قبر
میں لڑھک جاؤں کیوں کہ بقول ابوذر غفاری،
''زمین کی پیٹھ سے مجھے اس کا شکم زیادہ عزیز ہے۔'' [1]

مکاتیب کے آخر میں فرحت رابعہ کی یادداشتوں: ''سید علی عباس جلالپوری۔۔۔میرے اُستاذ'' اور پروفیسر حامد رضا کے مضمون: علی عباس جلالپوری۔۔ایک مثالی اُستاذ'' سے قبل پروفیسر لالہ رُخ بخاری کے نام محمد اسلم چیمہ ساکن کیلا سکے کا ایک خط مرقومہ ۱۳۔نومبر ۲۰۰۸ء درج کیا گیا ہے۔خط کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ۱۹۷۱ء میں علی عباس جلالپوری کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا۔خط میں انہوں نے پروفیسر صاحب کو اپنے احساسات میں شریک کرتے ہوئے علی عباس کو ایک حقیقت پسند، لازوال شخصیت، عظیم فلسفی، نقاد، ماہرِ تعلیم، بے مثل نثر نگار، پہلو دار شخصیت، عقلیت پسند، متحمل مزاج، رواداری کا حامل، نابغۂ روزگار، جاذب نگاہ، بے باک، درویش صفت اور زاویاتی سوچ کا حامل دانشور قرار دیا ہے۔انہوں نے مذکورہ کالج میں علی عباس جلالپوری کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر منعقدہ مشاعرہ کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں وہ دُلہا کی مانند اسٹیج پر رونق افروز تھے، جبکہ مہمانان میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، طفیل ہوشیارپوری، قیوم نظر، احسان دانش، اور عارف عبدالمتین کے علاوہ کئی دیگر نامور شعراء بھی موجود تھے، جبکہ محمد اسلم چیمہ صاحب شیشے کا جگ اور گلاس تھامے ہال میں ساقی گری کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔یہ ساری باتیں انتہائی خوش کن ہیں اور یقیناً انہوں نے خوبصورت الفاظ میں علی عباس کے ساتھ ملاقاتوں اور یادوں کے مرقعے تراشے ہیں۔تاہم جہاں کہیں علی عباس کے فرمودات یا فکر کا احاطہ کیا ہے، عجیب اور مضحکہ خیز نتائج سامنے آئے ہیں۔ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

''ایک روز دورانِ لیکچر انہوں نے فرمایا کہ ہمارے
ملک میں ایک ایسی شخصیت ہے کہ جو بات ہم ایک صفحہ میں

---

[1] سید علی عباس جلالپوری، مکتوب بنام سید محمد کاظم، جلالپور شریف، ۲۰ فروری ۱۹۸۶ء۔

لکھتے ہیں وہ ایک سطر میں بیان کر دیتے ہیں۔ حیران تھا کہ
آپ نے تو اس تقریر کو پارہ پارہ کر دیا تھا جو صدر پاکستان
یحییٰ خان نے ریڈیو پاکستان پر نشر کرنا تھی۔ اقبال کے
ناقدوں میں آپ کا شمار ہے۔ اقبال کو شاعر تصور کرتے ہیں
۔ ایک بڑا شاعر لیکن فلسفی نہیں مانتے۔ معلوم نہیں وہ کون سی
شخصیت ہے۔ میں نے پوچھا تو فرمایا'' وہ مولانا ابو اعلیٰ
مودودی صاحب ہیں۔'' اس سے قبل میں مولانا صاحب کو
نہیں جانتا تھا۔ بعد میں ہم نے اچھرہ میں اُن کی سوال
وجواب کی محفل میں بھی شرکت کی ۔ بلاشبہ مولانا بین
الاقوامی سطح کے عالم ہیں''۔[1]

پروفیسر لالہ رخ نے علی عباس کی بات پر حواشی میں تبصرہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے
کہ:'' مذہبی لوگ دلائل و براہین سے کام نہیں لیتے، جبکہ فلسفی اپنی بات ثابت کرنے کے لیے تفصیلی گفتگو کا
قائل ہوتا ہے۔'' علی عباس نے یہ بات طنز کے پیرایہ میں کی تھی، جب کہ یہ حضرت اچھرہ جا پہنچے۔ ایک
موقع پر اسلم چیمہ صاحب علی عباس کے فلسفیانہ کمال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''فرمایا کرتے کہ آدمی کی محبت عام مکھی کی سی ہے وہ اپنے
کوٹ میں گلاب یا کوئی خوش نما پھول اُڑس لیتا ہے۔ اس
کے بعد کوئی اور خوبصورت پھول دیکھتا ہے تو پہلا پھینک کر
اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ ایک جگہ مطمئن
نہیں ہوتا لیکن عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے۔
اس کی محبت شہد کی مکھی کی طرح ہوتی ہے۔
میں نے سید صاحب کی اس بات کو معاشرے

---

[1] محمد اسلم چیمہ، مکتوب بنام پروفیسر لالہ رخ بخاری، کیلاسکے ضلع گوجرانوالہ، ۳۰ نومبر ۲۰۰۸ء۔

میں ہر کہیں کارفرما دیکھا ہے۔ چھوٹی سی مثال سے ایک بڑی
حقیقت کی نشان دہی کرنا شاہ صاحب ہی کا شیوہ تھا۔ یہی
ایک فلسفی کا کمال ہے۔" [1]

ایک فلسفی کے کمال کو ایسی ارفع قسم کی مثال سے ثابت کرنا یقیناً اسلم چیمہ صاحب کا کمال ہے۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!! اگر علی عباس حیات ہوتے تو اس شاگرد رشید کو اپنے مخصوص اسٹائل میں داد دیتے کہ اس نے اپنے استاد کو حقیقی فلسفیانہ مقام عطا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہر حال مذکورہ مکتوب کو شاملِ کتاب کرنے کی منطق راقم الحروف کی فہم سے بالاتر ہے۔

ڈاکٹر طارق جاوید

---

[1] محمد اسلم چیمہ، مکتوب بنام پروفیسر لالہ رخ بخاری، کیلاسکے ضلع گوجرانوالہ، ۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء۔

پروفیسر لالہ رُخ بخاری

حرفِ آغاز

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ ۲۸ رجب کی نیاز پر میں اپنے دونوں بچوں صاحبزادہ کیوان جاہ[1] جو پری میڈیکل کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکے ہیں اور صاحبزادہ ضمیران جاہ[2] جو ہفتم جماعت کے طالب علم ہیں، کے ساتھ بیگم نفیسہ خالد کے یہاں مدعو تھی۔ چند روز قبل میری دوست آنسہ ثروت خالد نے فون کیا کہ مولا پنجتن پاک کی نیاز ہے تم ضرور آنا۔ بچوں نے تال مٹول کی مگر دوسرے دن اتوار کی تعطیل تھی چنانچہ میں نے دونوں کو ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ صاحبزادہ کیوان جاہ کے استاد جو گھر ٹیوشن پڑھانے آتے ہیں، سر ثاقب کو جلدی بلوا لیا اور صاحبزادہ ضمیران جاہ جو اپنے پاپا کی خواہش پر "Soft Solution" سے کمپیوٹر کورسز کر رہے ہیں، کے گھر لوٹتے ہی ہم 6:30 پر نکل کھڑے ہوئے۔ آج گاڑی چلاتے ہوئے دائیں گھٹنے میں ہلکا سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ مگر یہ چھوٹے موٹے مسائل تو میری زندگی کا جزو لازم ہیں۔ بیگم نفیسہ خالد کے خانۂ پاک میں خوب رونق تھی۔ مومنین خواتین و حضرات کی آمد و رفت جاری تھی۔ لوگ آتے کھانا تناول فرماتے اور رخصت ہو جاتے۔ اس منظر میں ادب آداب، سلیقہ، عمدہ گفتگو اور مجلسی تکلف آمیز اپنائیت بھی شامل تھی۔ بیگم نفیسہ خالد ذوالفقار علی بھٹو شہید کی گوجرانوالہ میں دستِ راست مانی جاتی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو ان کے ہاں قیام پذیر بھی رہیں۔ جب قائد عوام کا تختہ الٹا گیا تو غاصب کے ہاتھوں بیگم بھٹو نے لاٹھی چارج کا سامنا کیا۔ ان کی پیشانی سے بہتے لہو کو بیگم نفیسہ خالد کے آنچل نے نہایت محبت سے جذب کر لیا۔ بیگم نفیسہ خالد بچوں سے شفقت آمیز انداز میں ملیں۔ خوش وضع چوکیوں پر انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ گھر کے بچے کھانا پیش کرنے میں پیش پیش تھے۔ چند لقمے لینے کے بعد میری پشت کے بائیں کندھے کے قریب عجیب سا جلن آمیز درد شروع ہو گیا۔ میں نے پلیٹ پر سر جھکا لیا۔ دانت بھینچ لیے۔ مبادا ہونٹوں سے کراہ نکل جائے۔ ابا جان کہا کرتے تھے تکلیف کی حالت میں جبڑے بھینچ لو تو

[1] صاحبزادہ کیوان جاہ اب علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں ایم۔بی۔بی۔ایس، سال دوم میں ہیں۔

[2] صاحبزادہ ضمیران جاہ اب قائد اعظم ڈویژنل پبلک سکول گوجرانوالہ میں سال دہم کے طالب علم ہیں۔

برداشت کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ میں اکثر تکلیف کی حالت میں جبڑے بھینچ کر برداشت کرلیا کرتی تھی۔ مولا کو میرا صبر و برداشت کا امتحان مقصود تھا۔ جلن آمیز درد بائیں کندھے سے بائیں بازو اور بغل میں پھیل گیا۔ لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے جسم کا اتنا حصہ سُن ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن تقریباً دو منٹ کے بعد درد معدوم ہونے لگا۔ میں نے پانی پیا اور کسی کو بتائے بغیر اپنا کھانا ختم کیا۔ حبس کا موسم تھا۔ سب کو الوداع کہا اور گھر کے ایک بچے احسن علی سے کہا کہ میری گاڑی نکال دیں کیوں کہ میری گاڑی کے پیچھے تین گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ احسن علی نے گاڑی نکالی تو میں بچوں کو لے کر گھر آ گئی۔ صاحبزادہ کیوان جاوہ سے بایاں بازو اور کندھا دبانے کو کہا۔ بیٹے نے تسلی دی "ماما جی آپ بہت کام کرتی ہیں۔ فوراً اپنا چیک اپ کروائیں۔ صحت کا خیال رکھیں۔ ابھی تو آپ نے نانا ابو کی سوانح بھی لکھنا ہے۔" یہ سُن کر مجھے جیسے جھٹکا لگا۔ سوچا —— مصروفیات میں عمر نکل جائے گی اور وقتِ آخر نازل ہو جائے گا اور میرے کام —— کیا میرے کام ادھورے رہ جائیں گے۔؟ اور اب میں بیٹھی گزشتہ روز کی ساری باتیں سوچ رہی ہوں —— ابا جان کے خطوط کی فائل سامنے پڑی ہے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ان کے خطوط کو ترتیب دوں اور پہلی فرصت میں اشاعت کے لیے بھجوادوں۔ اس ضمن میں جناب ڈاکٹر طارق جاوید کی حوصلہ افزائی بھی شاملِ حال ہے اور اشاعت بھی انہیں سونپ رہی ہوں کیوں کہ مقام جلالپوری سمجھنے کے لیے علم و فن سے رغبت، ذوقِ جلیل، ارفع عقیدت و احترام کا ہونا لازم ہے اور پھر ڈاکٹر صاحب عقلیت پسندی کے پھیلاؤ کے لیے تواتر کے ساتھ عمل کی حالت میں ہیں۔ ان کا ماضی اور حال اور زیرِ نظر کتاب کا مقدمہ اس کی درخشاں مثال ہے۔ الغرض نسبتوں کا احاطہ تکمیل کو پہنچنے کو ہے اور میرا فرض بھی۔

والد گرامی کا مجھ سے بحیثیت بیٹی، لیکچرار، تیماردار، رازدار ایک خصوصی تعلق تھا جس کی بدولت میری ان کے ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ اکثر موصول ہونے والے خطوط کے جوابات بھی مجھ ہی سے لکھوایا کرتے تھے۔ میری عدم موجودگی میں حامد بھائی جان یا جعفر بھائی بھی یہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ پہلے خط کی املاء کروایا کرتے۔ پڑھنے کے بعد عبارت میں قطع و برید کرواتے، دوبارہ پڑھتے اور صاف کروا کے لکھواتے۔ میں صاف کر کے تحریر کو پیر وڈاک کر دیتی اور ترمیم شدہ تحریروں پر مبنی کاغذات محفوظ رہتے۔ چنانچہ والد گرامی نے جو مجھے یا دیگر اہلِ خانہ کو خطوط تحریر کیے وہ تو محفوظ تھے ہی لیکن میرے ہاتھ سے لکھوائے گئے خطوط بھی میرے پاس رہ گئے۔ ارادہ ہے کہ اُن کی خوش نما تحریر کی اپنی تسلی کے لیے اشاعت کا اہتمام کروں۔ میں سمجھتی ہوں بحیثیت ایک مفکر پروفیسر سید علی عباس جلالپوری پاکستان کے صحیح معنوں میں فلسفی اور دانشور ہیں جنہوں نے عالمگیر اصول و ضوابط پر اعلیٰ

اخلاقی نقائص کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ ایمانداری سے تحقیق کی اور علم کو کبھی ذریعہ منفعت نہیں بنایا۔ علمی شاہراہ پر فلسفیانہ افکار کی ترویج کے لیے منافقت تو درکنار کبھی سمجھوتا بھی نہیں کیا۔ خرد کے پل صراط کو کڑی ریاضتوں سے عبور کیا۔ دیانت داری سے شغف رکھا۔ حصول زر کا خیال بذریعہ فلسفیانہ علوم انہیں گناہ کبیرہ معلوم ہوتا تھا۔ ٹیوشن پڑھانا معیوب معلوم ہوتا تھا۔ میری ایک استانی تھیں جو ایف اے، سی ٹی استاد تھیں۔ اُن کے شوہر لیکچرار تھے۔ وہ بیوی کو طعنہ زنی کیا کرتے کہ تم معمولی استانی ہو۔ میرے علم کی وسعت کو کیا جانو۔ میری استانی جو کہ ہماری پڑوسن بھی تھیں، نے بی۔ اے پرائیویٹ طور پر پاس کر کے بی۔ ایڈ کا ارادہ کیا۔ والدِ گرامی اُن دنوں اورینٹل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ میری استانی کو بی۔ ایڈ کے کچھ اسباق میں دقت محسوس ہوئی تو وہ والد صاحب سے ملنے تشریف لائیں۔ باتوں باتوں میں مدعا بیان کیا "چند اسباق پڑھا دیجیے"۔ والد صاحب نے حامی بھر لی، اور دریافت کیا کہ "فیس بھی طے فرما دیجیے" فرمایا: "فیس دے کر پڑھنا مقصود ہے تو شہر لاہور میں پڑھانے والوں کی کیا کمی ہے۔ میں ایک گھنٹہ بھر روزانہ پڑھاؤں گا مگر فیس لینا باعث توہین سمجھتا ہوں۔" استانی صاحبہ نے کلامِ تشکر پیش کیا اور اس مدد بے غرض کا تذکرہ اپنی کئی احباب سے بھی کیا۔ میں نے کہا: "آپ سرکار سے بھی تو معاوضہ لے کر تعلیم دیتے ہیں۔ فرمایا: وہ ملازمت ہے۔ سرکار تنخواہ دیتی ہے تو طلبہ و طالبات کو یوں پڑھانا چاہیے کہ وہ ٹیوشن کی حاجت محسوس ہی نہ کریں۔ میں تمہیں افلاطون کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ ایک دن ایک شخص نے افلاطون سے ریاضی کا سوال پوچھا۔ افلاطون نے اسے سمجھا دیا۔ اس شخص نے پوچھا، "اس کا کیا فائدہ ہے؟" افلاطون نے اس شخص کو سونے کا ایک سکہ دیا اور کہا "یہ ایک سوال سیکھنے کا فائدہ وصول کرو اور آئندہ میرے پاس مت آنا کیوں کہ علم مالی منفعت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بنی نوع انسان کی قلبی و عقلی وسعت کے لیے ہوتا ہے۔"

اُس زمانے میں یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں میں پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ والدِ گرامی مجھے ایک دیومالائی داستان کا کردار محسوس ہوتے — ایک پراسراری دھند میرے اطراف میں پھیلی رہتی۔ اُن کی سوچ میں بے پناہ تسلسل تھا۔ میں دیکھتی ہوں وہ ڈرائنگ روم کے ایک بڑے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کسی غیر مرئی نکتے پر نظریں جمائے کسی نہ کسی فکر میں گم — بایاں ہاتھ بستر پر بے حرکت پڑا رہتا اور دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ سر کے درمیانی حصے کو سہلاتا رہتا، سر کے اس حصے پر بال کافی کم ہو گئے تھے — ہم بہن بھائی اُن کو سوچ میں مستغرق پا کر گھر میں بالکل خاموش ہو جاتے۔ ایسے عالم میں بلند آواز میں گفتگو یا ہمارا قہقہہ زن ہونا انہیں سخت ناگوار گزرتا۔

جب وہ کسی کتاب کی تالیف میں منہمک ہوتے تو شب و روز اُسی کے دھیان میں گم رہتے۔ ایک شب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی تھی۔ رات کے دو بجے تھے نجانے وہ کب بیدار ہوئے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں قرطاس تھا اور صریرِ خامہ۔ میں مارے حیرت کے بت بنی تکتی رہی۔ اس وقت کاغذ، قلم کا آہنگ میکانکی سا لگ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے بستر میں لیٹ گئی۔۔۔ نا معلوم کیوں پلکیں نم آلود ہو گئیں۔۔۔ اسی زمانے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اربابِ اختیار ان کے علمی قدوقامت سے خائف بلکہ بغض آمیز سلوک کرتے ہیں۔ کسی دوست سے بات کرتے ہوئے میں نے والد گرامی کا ایک جملہ اپنی سماعت میں آج بھی محفوظ کر رکھا ہے۔ ''استحصال زدہ معاشرے میں عدل و انصاف کی توقع کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔''

والد گرامی کے پاس ہمارے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ والدہ گرامی کو یہ بات زیادہ کھٹکتی تھی اور کبھی کبھار ان کے درمیان تکرار بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دن اس بدمزگی میں کہنے لگے: ''اب سمجھ میں آیا کہ گبن نے تاریخ عالم مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنی زوجہ کو کیوں فارغ کر دیا۔''

میں سنِ شعور کو پہنچی تو میرا خوف قدرے کم ہو گیا اور میں اُن کا تھوڑا بہت وقت چرانے لگ گئی۔ ایک بار میں نے اپنی والدہ کی طرف داری کی تو فرمایا: ''فلسفی کو شادی اور بچوں میں نہیں پڑنا چاہیے کیوں کہ فلسفی دنیا داری سے دور ہو جاتا ہے۔''

ایک اور موقع پر میں نے انھیں بڑبڑاتے سنا: ''یہ حماقت سال میں چند بار کرنا ہی پڑتی ہے۔'' آج بھی اس صورتِ حال کا منظر آنکھوں میں جاگتا ہے تو اس بڑبڑاہٹ پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔

ارادہ ہے کہ میں اپنی بساط بھر کوششوں سے آپ کی سوانح ترتیب دوں۔ لوگ کہتے ہیں تم تو اُن کی تخلیقات پر پی ایچ۔ ڈی کر سکتی ہو۔ معلوم نہیں کیوں دل نہیں چاہتا کہ میں اپنی محبتوں کے مرکز کو ذاتی مفاد کا ذریعہ بنالوں۔ ہاں صاحبِ ادراک و صاحبِ مودّت خوب جانتے ہیں کہ ایک طالبِ علم بیٹی اپنے شاندار روایات کے حامل والد کے لیے کیا احساسات رکھتی ہے۔۔۔ اُن آنکھوں کو سلام جو محبت کی ارفع پاکیزگی محسوس کر کے شبنم آلود ہیں۔۔۔

تذکرہ خطوط کا ہو رہا تھا اور قلم کی جولانیاں مجھے کس سمت لے گئیں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے ان یادوں کو سمیٹنا ہے، ترتیب دینا ہے اور گوشۂ دل کی رونق عیاں کرنا ہے کہ جلالپوری کے چاہنے والوں کو ان باتوں میں شامل کر سکوں۔ ''مکاتیب جلالپوری'' میں خطوط کا طرزِ تحریر سادہ لیکن ادیبانہ شکوہ سے مملو ہے۔ ان میں زیادہ تر خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں: بیگم اور بچوں کے نام، دوستوں کے نام، چاہنے والوں کے نام اس

گل میں جتنے بھی لالہ و گل ہیں وہ سب عیاں کر دینا ہی انسب ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے امی جان کو اسے ارسال کیے اُن کو ترتیب دوں گی۔ امی جان کا تعارف بھی ضروری ہے۔ میرے نانا جان اشرف خان کو کتب بینی سے خاص طور پر لگاؤ تھا۔ پیشہ تو زمینداری تھا مگر وہ سب مزارعین یا بچوں کے سپرد تھا۔ ایک ذاتی لائبریری اُن کے شوق کی عکاس تھی۔ میرے ابا جان کے ننھیال سوری قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور میری والدہ اسی برادری سے منسلک تھیں۔ ابا جان کے سوتیلے عزیزوں نے اُن کی سادات گھرانے کی صاحبزادی سے منگنی چھڑوادی اور پھر جہاں بھی سلسلہ جنبانی شروع ہوتا —— وہاں مکار کٹنیاں بھجوادی جاتیں جو والد کی کردار کشی کرتیں اور بات بنتے بنتے رہ جاتی۔ میرے دادا جان تو تبھی وفات پا گئے تھے جب ابا جان بی۔ اے میں زیرِ تعلیم تھے۔ دادی جان فضل بیگم نے ہمت نہ ہاری۔ چنانچہ دادی جان نے ابا جان کا رشتہ اپنے ملنے والوں میں طے کر دیا۔ حسب روایت وہاں بھی رشتہ ختم کروانے کی سازشیں ہوئیں لیکن میرے نانا جان جو ابا جان سے مل چکے تھے (اور ان کی زبانی یہ معلوم کر چکے تھے کہ سوتیلے عزیز ٹھانے بیٹھے ہیں کہ عباس کی شادی نہیں ہونے دیں گے تا کہ اس کی جائیداد ہم ہڑپ کر سکیں) ان کے علمی قد و قامت سے واقف ہو چکے تھے۔ ان کے دراز قامت وجیہہ سراپے کو پسند کر چکے تھے۔ چنانچہ جو منظورِ خدا تھا ہو کے رہا اور عباس کی شادی ہو گئی۔ اہلِ بغض کے یہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جیسی کہ صدیوں پہلے ان کے جدِ امجد علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت کے موقع پر اہلِ بغض نے کہا: "کاش یہ خبر سننے سے پہلے آسمان گر پڑتا یا زمین پھٹ جاتی۔" میں نے ایک بار امی جان سے پوچھا "کیا آپ نے ابا جان کو شادی سے پہلے دیکھا تھا۔"

امی جان نے مسکرا کر اثبات میں جواب دیا۔ وہ کسی وجہ سے "چٹن وال" (جلال پور شریف سے چند گاؤں چھوڑ کر آتا ہے) اپنی بڑی آپا کے یہاں مقیم تھیں، عباس بھی وہاں ہی تھے۔ ایک درخت کے نیچے سفید لباس میں ملبوس۔ کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک —— مجھے یوں لگا جیسے کتاب اور یہ شخص لازم و ملزوم ہیں —— وہ تو کوئی ماورائی مخلوق کی مانند تھے —— جب ان کا پیام آیا تو میں نے اپنی قسمت پر رشک کیا۔"

جب دونوں میں تکرار ہوتی تو میں انہیں ہنسانے کے لیے کہتی: "ماورائی مخلوق" تو اُن کے چہرے کا تناؤ کم ہو جاتا تھا۔ امی جان نظمیں بھی کہتیں اور روزنامچہ بھی لکھتیں۔ انہیں کتب بینی کا ازحد شوق تھا۔ ہر قسم کی کتب، رسائل اور اخبارات زیرِ مطالعہ رہے۔ پی ٹی وی سے آنے والی تمثیل لازمی دیکھتیں جن میں دیواریں، آسمان تک دیوار، وارث، خدا کی بستی، اشفاق احمد کے ڈرامے، "ایک محبت سو افسانے" وغیرہ شامل تھے۔ 9:00 خبر نامہ ضرور سنتیں اور ساتھ ساتھ وزراء پر تبصرے بھی کرتیں۔ میاں بیوی سیاست پر گفتگو کرتے وقت بالکل جگری دوست محسوس ہوتے —— ابا جان مولا علیؑ کے اوصاف جلیلہ سے دلی

اُنسیت اور مودت رکھتے جبکہ امی جان سرسید احمد خان کے خیالات کی پیروکار تھیں لیکن اس موضوع پر دونوں میں کبھی بدمزگی نہ ہوئی۔ امی جان کا موقف تھا جس سے چاہو محبت کرو مگر یوں کہ کردار کی پیروی نظر آئے۔ کسی کو برا کہنا وہ معیوب سمجھتی تھیں ــــ وہ محبت کرنے والی بیوی اور ماں بھی تھیں۔ گوجرانوالہ دوران ملازمت، ابا جان غالباً 45 برس کے تھے، ایک دوپہر بے ہوش ہو گئے ــــ گرمی کی شدت عروج پر تھی۔ ہم سب بہن بھائی صغرسنی میں تھے۔ امی جان بھٹکتی نجانے کس مشکل سے ایک ڈاکٹر آصف نامی طبیب کو گھر لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طویل معائنہ کیا۔ ادویات دیں اور والد صاحب کو قلب کے عارضے کے شک کے بارے میں بتایا اور کہا اگر آج کی رات آپ نکال گئے تو خیر رہے گی۔ امی جان اس رات پلک بھی نہ جھپک سکیں۔ سحر کو چڑیاں چہچہائیں تو ابا جان کے سرہانے جا کھڑی ہوئیں ــــ وہ گہری نیند میں تھے۔ سانسوں کی سرسراہٹ محسوس کر کے قدرے مطمئن ہو گئیں ــــ نماز پڑھی اور دیر تک دعا کے لیے ہاتھ بلند رکھے ــــ والد گرامی بیدار ہوئے تو بقول اُن کے انہوں نے خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھا: ''بچ گیا'' نظر سامنے پڑی تو امی جان مصلے پر تھیں ــــ یقیناً اس وقت دونوں زندگی کی سرشاری سے مسرور ہوں گے ــــ ابا جان کہا کرتے تھے: ''اس رات تمہاری ماں نے مجھے موت کے جبڑوں سے کھینچ لیا۔''

وہ ہم سے بے پناہ پیار کرتی تھیں گو کہ اس کا سخن میں اقرار کبھی نہیں کیا مگر ہمارے لیے اپنی ہر ذمہ داری شوق سے نبھاتی رہیں۔ جو بھی بیمار ہوتا اس کی تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتیں۔ پرہیزی کھانا، وقت پر دوا، پھل کا اہتمام اور مکمل آرام کے لیے تگ و دو میں مشغول رہتیں۔ ملازمت کے سلسلے میں اکثر والد گرامی کے ساتھ پنڈی گھیب، ملتان، گوجرانوالہ، لاہور رہتی رہیں مگر تعطیلات گرما میں جلالپور شریف ضرور جاتیں۔ اکثر ہم بھی ساتھ ہوتے۔ گھر میں تعمیر و توسیع کرواتی رہتیں۔ کبھی کبھار ابا جان سے روٹھ جاتیں تو اپنی بڑی آپا حمیدہ کے ہاں چلی جاتیں اور پھر وہاں سے جلالپور شریف، دریں اثناء ابا جان انہیں منا لیا کرتے۔ آخری بار لاہور میں جھگڑا ہوا تو سوٹ کیس تیار کر لیا۔ برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ابا جان نے سوٹ کیس ہاتھ سے لے لیا اور نرم لہجے میں بولے: ''بس بھئی اب کہیں نہ جانے دیں گے۔'' اس پر آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور دونوں میں صلح ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے جھگڑا کرتے دونوں کو نہیں دیکھا۔ دراصل امی جان کی شدید خواہش تھی کہ لاہور میں گھر بنایا جائے۔ ایک بار وہ جن خاتون کے ہاں میلاد پر جایا کرتی تھیں اُن کے گھر کے ساتھ والا پلاٹ پینتیس ہزار میں بک رہا تھا اور اس کا رقبہ تقریباً بارہ مرلے تھا۔ جب انہوں نے بار بار ابا جان سے تقاضا کیا تو وہ چڑ گئے۔ انہیں ایک بات کو دہرانا ناپسند تھا پھر معاشی وسائل بھی اتنے زیادہ نہ تھے کہ ایک خطیر رقم مہیا کر سکتے۔ (اس زمانے میں یہ ایک خطیر رقم

گی اگہری بات یہ کہ اُن کا ہمیشہ سے ارادہ رہا کہ وہ جلالپور شریف اپنے آخری ایام بتائیں گے لہٰذا انہوں نے امی جان کو اصرار کرنے سے روک دیا پھر امی جان حساس بھی بہت تھیں، زود رنج ہونے کے باعث روٹھ جایا کرتی تھیں ــــــ ایک بار ایک خاتون نے انہیں بتایا کہ اُن کے شوہر گھریلو کاموں میں بہت ماہر ہیں جس کی وجہ سے اُن کو کاموں میں بہت آرام رہتا ہے۔ امی جان کے چہرے پر تمسخر جھلکا۔ انہوں نے صاف انداز میں کہا: ''مرد عورتوں کی طرح کام کریں ــــــ مجھے پسند نہیں ــــــ میرے شوہر تو جب صاف ستھری پوشاک میں اپنی کرسی میز پر بیٹھے لکھ رہے ہوتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ابا جان کی ہمیشہ کوشش رہتی کہ امی جان کے لیے کسی ملازم یا ملازمہ کو رکھا جائے، بابا گاما، شیدو بی بی، جمیل، پٹھانی، بھیجاں، ماہے، نوراں اور ایسے کئی خدمت گار موجود رہے۔ امی جان کو کبھی ان کا کام پسند نہ آتا تو برملا ٹوک دیتیں۔ ابا جان نرم مزاجی سے ملازمین کی دلجوئی کر کے انہیں رکھتے تو امی جان کہتیں ''آپ انہیں بگاڑ دیتے ہیں۔'' کبھی کبھار زچ ہو کر ابا جان مجھے کہتے ''میں ملازم رکھتا ہوں اور تمہاری ماں انہیں بھگانے پر تلی رہتی ہیں۔'' امی جان بے حد محنتی خاتون تھیں کبھی ملازم کسی وجہ سے گھر پر نہ ہوتے، گاؤں چلے گئے ہوتے تو امی جان پورے گھر کا کام اکیلی کر لیا کرتیں۔ ابا جان کے دوستوں کی دعوت میں انہوں ڈھیروں کھانے خود ہی تیار کیے۔ ''مکھڈی حلوہ'' ان کے دوستوں کو بہت پسند آیا۔ سردیوں میں انواع واقسام کے حلوہ جات اور پکوان ایسے لذیز بناتیں کہ آج بھی یاد کر کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ نفاست پسندی میں یکتا تھیں۔ گاؤں کی عورتوں میں مشہور تھا کہ عباس شاہ کی دلہن پانی میں خوشبو ملا کر نہاتی ہے۔ کھانے میں ہاتھ بھرنا سخت ناپسند کرتیں اور آم کی قاشیں بھی چمچ سے کھایا کرتیں۔ شادی کے بعد میں جب بھی اُن سے ملنے جاتی، تو کہتیں، ''اپنی صحت کا خیال رکھا کرو، کیسا زرد چہرہ ہے۔'' ماں کے علاوہ بیٹی کو کون جان سکتا ہے اور ماں ہی ہے جو اُن کہی باتیں سمجھ سکتی ہے۔ ہر محبت کرنے والی ماں سے میں محبت رکھتی ہوں۔ بیٹی کا میکہ ماں باپ ہی سے باعث کشش ہوتا ہے وہ بے غرض چاہت، بیٹی کی خوش حالی، شوہر کا اچھا سلوک، مسرتوں کے لیے سراپا دعا ہوتا ہے۔ اسی لیے بیٹیاں ماں باپ کے جانے کے بعد دل ہی دل میں نیم پیوست تیر کی سی چبھن میں لب کو رنگ جنتلا رہتی ہیں۔ امی جان اس وقت میرے قلم سے الفاظ، آنکھوں سے اشک رواں اور ذہن میں آپ کی یادیں برکھا رت کی رم جھم بن کر اُمڈی پڑتی ہیں۔ میں اپنے بچوں کے سامنے اس کیفیت میں نہیں لکھ سکتی۔ میں جانتی ہوں وہ اپنی ماں کو بلک بلک کر روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ کہنے کو ان گنت واقعات ہیں مگر سر دست موضوع وہ خطوط ہیں جو ابا جان نے انہیں وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ کئی خطوط میں سنہ موجود نہیں ہے۔ بس اندازے سے ترتیب دے رہی ہوں۔ بشر ہوں خطا کوشی سرشت میں وراثت کی صورت نصیب ہوئی

ہے۔ تدبیر بس میں ہے سو حاضر ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں امی جان کا اپنے نام ایک خط تحریر کرنا چاہتی ہوں تا کہ ان کی شخصیت بھی متعارف ہو سکے۔ یہ خط میری شادی کے بعد انہوں نے تحریر کیا تھا جب انہیں چھاتی میں بننے والی گٹھلی کے چیک اپ کے لیے راولپنڈی (میری بڑی بہن گل شگفتہ بھی اُن دنوں راولپنڈی ہی میں مقیم تھیں) جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں یہ کینسر نہ ہو۔ چنانچہ خط کا انتظار رہتا۔ جلد ہی اُن کا خط موصول ہوا۔ اُن دنوں میری ملازمت لالہ موسیٰ میں تھی۔ موبائل فون متعارف نہ تھا اور آفس فون استعمال کرنا ہمیں منع تھا سو خطوط بڑا سہارا ہوتے۔

لالہ رُخ بخاری

۱۴ اگست ۱۹۹۳ء

آزادی مبارک پاکستان زندہ باد

پیاری لالہ خوش رہو!

السلام علیکم!

تمہاری چٹھی ملی۔ اتنی تشویش اور فکر کی ضرورت نہیں۔ میں ۱۲ کو واپس اس لیے پنڈی سے آ گئی کہ ڈاکٹر نے جو مواد انجکشن سے لیا ہے۔ لیبارٹری سے نتیجہ اس کا ۱۶ تاریخ کو ملنا تھا پھر معلوم ہوگا کہ یہ کیا چیز ہے اور آگے اس کا کیا علاج ہوگا۔ ہم وہاں دس دن رہے تو پھر میں اس لیے بھی وہاں سے آ گئی کہ نغمانہ[1] گجرات گئی ہے تو گھر میں ہونا ضروری ہے۔ نغمانہ ۹ کو آ گئی تھی۔ علی[2] کو ساتھ لائی تھی اس کے دانت اوپر کے دانتوں سے نیچے کی طرف سے نکل رہے تھے تو حامد نے ڈاکٹر سے مشورہ کے مطابق اوپر والے دانت نکلوا دیئے ہیں۔ وہ پھر علی کو لے کر گیارہ کو چلی گئی ہے کہ اس کے پرچے ابھی باقی ہیں۔ تو یہ ہے رام کہانی یہاں کی۔

لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کر کے مشورہ دیا تھا گنگا رام ہسپتال ڈاکٹر خالدہ عثمانی کے ہاں چلے جاؤ میں سفارش بھی کروں گی۔ اب وہاں مسئلہ رہائش کا تھا اس لیے ہم پنڈی چلے گئے۔ وہاں بڑی سہولت سے رہے۔ گل کا اب بہت اچھا مکان ہے۔ کھلا بھی اور ساری سہولت سے آراستہ بھی وہ سب لوگ تم کو بہت یاد کرتے ہیں کہ خالہ[3] تمہارے پاس نہیں آئے گی یا وہ اب ملازمت چھوڑ چکی ہے۔ لڑکیوں[4] کے دل میں یہ خیال ہے کہ جب مس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ نوکری چھوڑ دیتی ہے۔ خاصا مذاق رہا۔ ساجد[5] کہتا تھا کہ ہمیں ان کا پتہ معلوم نہیں ہم نے تو ان کی دعوت کرنی ہے اور سیر سپاٹا کرانا ہے۔ جب چھٹیاں ختم ہو جائیں گی تو پھر تم کیسے فراغت سے نکل سکو گی۔ خیر یہ تم لوگوں کا مسئلہ ہے۔ تم سب لوگوں کا شکریہ کہ دعاؤں میں یاد رکھا۔ جعفر[6] اب بالکل خیریت سے ہے۔ آپ لوگوں کو یاد تو کرتا ہے مگر خط لکھنے میں سست ہے۔ اعجاز[7] کو دعا اور ساجد پوچھتا تھا کہ کیا آرمی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ میں کیا بتا سکتی تھی۔ اب پنڈی سے خط لکھوں گی ساجد سے پتہ لکھوا کر۔

تمہارے ابا جان اچھے ہیں۔ خارش کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔ خارش تو سب کو ہوئی تھی مجھے اور جعفر کو تو بہت ہی ہوئی مگر اب آرام ہے۔ پنڈی بھی گل اور ساجد کو تو شدید تھی۔ بچوں کو بھی تھی مگر دوا کے استعمال سے آرام آ گیا۔ گل بھی تم کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی صحت بھی نارمل نہیں رہی۔ اس کے لیے دل بہت

۱۔ حامد بھائی کی بیگم ۲۔ حامد بھائی کا بڑا بیٹا۔ ۳۔ لالہ رخ۔ ۴۔ گل شگفتہ کی بیٹیاں۔ ۵۔ گل شگفتہ کے شوہر اور ابا جان کے بھانجے۔
۶۔ جلالپوری کے چھوٹے بیٹے۔ ۷۔ لالہ رخ کے شوہر۔

ہی کڑھتا ہے مگر اللہ کی مرضی۔ راضو خوش ہے۔ رخسانہ[1] نعمانہ کے آنے کے بعد چلی گئی تھی کہ پھر آؤں گی۔ ہاں پنڈی میں غزالہ[2] ملی تھی بہت خوش تھی تم کو یاد کرتی تھی کہ میں نے یہاں سیر و سیاحت کے لیے اسے دعوت دی تھی وہ آئی ہی نہیں۔ صغرا[3] بھی تم کو بہت یاد کرتی تھی اس کی بہن بھی وہاں ہی ہے۔ صغرا تو اتنی موٹی ہو رہی ہے۔ مبارک کہتی تھی اور سلام کہتی تھی۔ اب میں پھر ۱۶ کو شاید پنڈی جاؤں بچے گھر میں نہیں ہیں تو بالکل چپ چاپ ہے۔ طوطا بھی صفی[4] کو پکارتا رہتا ہے۔ گل کا مکان ڈھوک کھبہ میں ہے جہاں تانگے لیے جاتے ہیں ساتھ ہی فوجیوں کی وردی تیار کرنے کی فیکٹری ہے بہر حال تم کو جب جانا ہوا تو حامد سے پورا پتہ لے کر جانا اور میرے لیے اتنا تردد اور فکر کی ضرورت نہیں اللہ رحم کرے گا۔ ہاں تم نے لکھا ہے کہ پانی پیتی ہوں۔ زیادہ پانی پینے کا یہ مطلب نہیں کہ غذا ہی چھوڑ دو۔ کبھی کبھار جو طبیعت میں بوجھل پن یا گری محسوس ہوئی تو "یورو ڈوتال" ایک آدھ دفعہ پی لیا۔ ہاں اگر کوئی دوسرا مسئلہ ہے تو بھی ڈاکٹر سے مل کر غذا کا پورا خیال رکھنا۔ غذا چھوڑنے سے تو کمزوری ہو جاتی ہے جو نقصان دہ ہوتی ہے۔ بہر حال اپنی صحت کا پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اپنے معاملے میں تم کو آگاہ کرتی رہوں گی۔ فکر نہ کرو اللہ مالک ہے۔ سب گھر والوں کو درجہ بدرجہ دعا سلام پیار۔ تمہارے ابا جان سے دعا پیار۔ راضو[5] سے سلام۔

تمہاری امی

میری بہادر ماں نے کینسر کا آپریشن کروایا اور بڑی ہمت و برداشت سے یہ تکلیف دہ مراحل طے کیے۔ بلا شبہ یہ اُن ہی کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے ایک مسلسل مصروف تحقیق دانش ور کے ساتھ عمر بتا دی۔ بہت سے معاملات میں والد گرامی انہیں سراہتے بھی تھے۔ مگر اختلاف رائے کی آزادی سے معاملات بگڑ بھی جاتے۔ پہلا خط جو میرے ریکارڈ میں ہے بھوچھال کلاں سے 8 جون 1953ء کو لکھا گیا جب ابا جان بحیثیت مدرس وہاں تعینات تھے اور ساتھ ساتھ امتحان بھی دے رہے تھے۔

1۔ امی جان کی بھانجی، خالہ زبیدہ کی بیٹی۔ 2۔ ماموں جان افضل کی بیٹی۔ 3۔ الہ موتی میں ہماری باورچن۔ 4۔ حامد بھائی کا چھوٹا بیٹا سجاول۔ 5۔ ملازم

... پچیاں کلاں

... جون ۵۳ء

ڈیئر بیگم!

مجھے لاہور تمہارا خط ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں تو سر کھجانے کا موقع نہیں ملتا اور یہ امتحان بالخصوص کچھ بے ڈھب قسم کا تھا۔ اس سال تین پرچے ہوئے ہیں اگلے سال چار پرچے ہوں گے۔ اُمید ہے کہ اس حصہ میں کامیابی ہوگی۔ پرچے اچھے ہو گئے ہیں۔ خورشید[1] آپا سے بھی ملاقات ہوئی مگر میں نے اُن سے امتحان کا ذکر نہیں کیا۔ اُن کا تبادلہ گجرات ہو چکا ہے اور وہ لاہور چھوڑنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ ممکن ہے اب تک گجرات پہنچ گئے ہوں۔ وہ سب لوگ بخیریت تھے۔ لاہور کی شدید گرمی سے میری طبیعت ناساز ہوگئی تھی۔ الحمدللہ اب آرام ہے۔

ہمیں عید کی صرف تین چھٹیاں ہوں گی۔ دو دن صرف آمد و رفت کے لیے چاہئیں اس لیے میں نے عید پر جلال پور جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ سوائے سفر کی بھاگ دوڑ کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تبادلے کے احکام کا ہنوز انتظار ہے۔ ممکن ہے عید کے بعد موصول ہوں۔ لاہور میں ترقی کے لیے بھی کوشش کی تھی۔ حسنات[2] صاحب دلچسپی لے رہے ہیں۔ انشاءاللہ کچھ نہ کچھ بہتری کی صورت ہو ہی جائے گی۔ گرما کی تعطیلات میں پھر لاہور جاؤں گا۔

اپنے حالات سے بالتفصیل مطلع کرنا۔ امید ہے کہ عزیز حامد[3] اور عزیزہ شہناز[4] بخیر و عافیت ہوں گے۔ عید پر کمیوں (جھیور، نائی، کمہار، توراں) کو ایک ایک روپیہ اور روٹی دینا۔ اُمید ہے کہ پچاس روپے مل گئے ہوں گے۔ رات کو اپنے پاس دو ایک عورتیں ضرور رکھا کرو۔ ڈنگہ سے خیریت کا خط آیا تھا۔

علی عباس

۱۔ خورشید آپا امی جان کی بڑی بہن تھیں۔

۲۔ حسنات صاحب لاہور میں بطور ڈپٹی کمشنر تعینات تھے۔ یہ ابا جان کے عزیز تھے۔

۳۔ عزیز حامد سب سے بڑے صاحب زادے سید حامد رضا، پروفیسر شعبہ تاریخ ۴۔ امی جان کی عزیزہ۔

۲۷ جون ۵۳ء

گورنمنٹ ہائی سکول چکوال

ڈیئر بیگم!

تمہارا خط ملا۔ میں نے کل اس سکول میں چارج لے لیا ہے۔ عزیز اختر[1] کامیاب ہوا ہے مگر کالج بند ہو چکا ہے۔ اس لیے گرما کی تعطیل کے بعد داخل ہو سکے گا۔ بہتر ہے تم جلدی جلال پور شریف لوٹ جاؤ اور وہیں مستقل اقامت اختیار کرو۔ بالفعل میں ایک دوست کے پاس مقیم ہوں۔ چھٹیوں کے دوران میں مکان تلاش کریں گے۔ خان صاحب[2] قبلہ کو سلام علیکم۔ آپا بی[3] اور اجمل[4] صاحب کو سلام مسنون۔ ننھی اور حامد سلما کو دعوات۔

خیر طلب

ع ع

---

۱ عزیز اختر: پھوپھی جان زہرا کے بڑے بیٹے جو والدین کی وفات کے بعد ننھیال میں پلے بڑھے۔

۲ اشرف خاں: میرے نانا جان

۳ آپا بی: امی جان کی بڑی بہن حمیدہ بیگم

۴ امی جان کے لاڈلے بھائی اجمل

درج بالا خط امی جان کو جیلاں میں بھجوایا گیا تھا۔ جیلاں امی جان کا میکہ تھا۔

(ڈنگہ)

۲۱۔ جولائی ۵۳ء

ڈیئر بیگم

آج تمہارا تار ملا۔ لاہور بس موجود نہیں تھی اس لیے میں یہیں چلا آیا۔ ویسے بھی آنا تھا۔ بس نہ ملنے سے بے بے جی[2] کے نیاز حاصل کرنے کا موقع جلدی مل گیا۔ ان کی طبیعت علیل رہی ہے۔ اب بھی ضعف و نقاہت بدستور ہے۔ اس حالت میں بھی بدستور نبھائے جا رہی ہیں۔ تار دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ خط لکھ دیا ہوتا۔ بے بے جی نے محسوس کیا ہے کہ ہمارے ہاں تمہارا دو چار دن کا قیام بھی تمہاری بیوی کو ناگوار گزرتا ہے۔ اس سے مجھے اچھی خاصی ندامت ہوئی۔ بعض دوسرے معاملات کے لیے بھی یہاں دو چار دن رہنا ضروری تھا۔ ان امور سے فارغ ہو کر ہفتہ عشرہ تک انشاءاللہ جلال پور پہنچ جاؤں۔ بھیجاں[3] یہاں سے چلی گئی ہے۔ بھینس دو ماہ سے ''سُوئی'' ہوئی ہے۔ بے بے جی کا خیال ہے کیوں نہ حامد کو ہفتہ عشرہ کے لیے یہاں رکھا جائے۔ ٹھنڈے پانی کی فراوانی ہے سایہ ہے آب و ہوا بھی خوشگوار ہے۔ وہ کہتے ہیں ننھی[4] کو دیکھنے کا شوق بھی ہے۔ بہر حال وہاں پہنچ کر پروگرام بنائیں گے۔ گھبرانا مت۔ میں عنقریب پہنچ جاؤں گا۔ عزیزاں کو دعوات، بے بے جی کی طرف سے دعوات۔ جواب جلد دینا۔

علی عباس

۱۔ ڈنگہ: ابا جان کے ننھیال کا گاؤں یہاں ان کے ماموں ہدایت خان لاولد ہونے کی وجہ سے اپنی جائیداد ابا جان اور چچا جان سید علی اصغر کو دے گئے۔ دادی جان وہیں رہا کرتی تھیں۔

۲۔ بے بے جی: ابا جان کی والدہ ''افضل بیگم'' میری دادی جان نہایت خاموش طبع اور مشفق ماں تھیں۔

۳۔ بھیجاں: سادات خاندان سے عقیدت کا رشتہ تھا بعد ازاں ہدایت خاں سے نکاح کر لیا۔ اصل نام غالباً فاطمہ بی بی تھا۔

۴۔ ننھی: میری بڑی باجی گل شگفتہ۔

ڈیئر شہزادی

میں نے یہاں پہنچ کر ایک خط بھیجا تھا۔ اس میں دس روپے کا ایک نوٹ بھی ملفوف تھا۔ البتہ یہ خط حسو[1] کی معرفت نہیں بھیجا گیا۔ اس کے جواب کا ہنوز انتظار ہے۔ تم مجھ سے شاکی ہو کہ جلدی خط کا جواب نہیں دیتے۔ اب یہی فروگزاشت خود تم سے ہو رہی ہے۔ اب جب کہ تم اکیلی ہو مجھے تمہارا اور بچوں کا بے حد فکر دامن گیر ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرا سابقہ خط کہیں ضائع نہ ہو گیا ہو۔ لفافہ ساتھ بھیج رہا ہوں۔ واپسی ڈاک اپنے جملہ حالات و کیفیات سے مطلع کرنا اور بچوں کی صحت کی خبر دینا۔ اعجاز[2] مجھ سے دو کتابیں مستعار لے گیا تھا۔ وہ واپس منگا لینا۔ نوراں[3] وزن لے آئے گی۔ عزیز اختر جلالپور پہنچا ہے کہ نہیں؟ عزیز حامد سلمہ اور عزیزہ شہناز سلمہا کو دعوات۔

خیر طلب

عباس

---

1. گاؤں کا فرد
2. ابا جان کا ایک کزن
3. گھر کی ملازمہ

ڈیئر شہزادی!

تمہاری چھٹی ملی۔ میں نے تمہارے سابقہ خط کا مفصل جواب لکھا تھا۔ حیرت ہے تمہیں وہ خط کیوں نہیں ملا۔ میرا خیال ہے جس کو دس روپے کا نوٹ ملا ہے اس کے منہ لہو لگ گیا ہے اور اب وہ میرے ہر ایک خط میں نوٹ کی تلاش کرتا ہے۔ اختر نے ڈنگہ لوٹنے کی جلدی کی۔ اس کے وہاں رہنے سے مجھے بھی اطمینان میسر تھا۔ کنویں والی زمین سے گندم اور بھوسہ آیا ہے کہ نہیں۔ اس سال فصل خراب تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور آئے گا۔ حسو سے کہنا وہ مہدی[1] کو کہے کہ حصے ٹھیک کیے جائیں اور بھوسہ کا بھی ٹھیک حصہ کیا جائے۔ جو کچھ آیا کام آئے گا۔ میں انشاء اللہ گرما کی چھٹیوں میں زمین تقسیم کرا کر جھگڑا ہی ختم کر دوں گا۔ تم بے شک اُن لوگوں کی کسی ملنے والی سے کہہ دینا کہ ہم زمین تقسیم کرائیں گے اور روز روز کے اس جھگڑے کو ختم کر دیں گے۔

عزیز حامد کی علالت کی خبر سے تشویش ہوئی۔ تم اچھی خاصی فہمیدہ ہو کر کیوں ہر وقت میرا ذکر اس کے سامنے کرتی رہتی ہو۔ اس سے بچہ حسرت اور اداسی کے تلخ احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے جو ایک نفسیاتی بیماری کا باعث ہوتا ہے اور یہ جذباتی محرومی اس کی صحتِ جسمانی کے لیے بھی مضر ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ میرا ذکر کرے تو ادھر اُدھر ٹال مٹول کر دیا کرو۔ شربت صندل بھی اچھا ہے۔ میرے خیال میں کبھی کبھی دن میں ایک آدھ دفعہ شربت بزوری استعمال کرے تو زیادہ مفید رہے۔ شربت بزوری معدے اور جگر کی حرارت رفع کر کے تسکین دیتا ہے۔ جلالپور الحق کی دکان سے اچھا ملے گا۔ تھوڑا سا منگوا کر دیکھنا۔ اچھا ہوا تو زیادہ منگا لینا۔ نوراں کے ذریعے خاص طور پر بنوا لینا۔ امتحان کی اطلاع آ گئی ہے۔ 26 مئی کو شروع ہو کر 30 مئی کو تینوں پرچے ختم ہو جائیں گے۔ ہمیں محکمہ کی طرف سے صرف اتنی ہی اجازت ملتی ہے کہ امتحان میں شریک ہو سکیں۔ دو دن آنے جانے کے لیے ملتے ہیں۔ عید پر آنے کی کوشش کروں گا ورنہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں ضرور آؤں گا۔ انشاء اللہ۔ ابھی تک میرے تبادلہ کے احکام موصول نہیں ہوئے۔ لاہور سے پتہ لگ جائے گا۔ اگر کوئی بہتر صورت نہ ہوئی تو گجرات نارمل سکول میں تبادلہ کی کوشش کا بھی خیال ہے۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ میں لاہور کے پتہ کا لفافہ اس لفافہ میں بھیج رہا ہوں۔

---

[1] مزارعہ

خط لکھ کر پوسٹ کر دینا۔ مجھے مل جائے گا۔ میں انشاءاللہ ۲۴ مئی کو لاہور چلا جاؤں گا اور ۳۱ کو واپس آ جاؤں گا۔ محلے والیوں سے رواداری کا برتاؤ کرنا۔ آج کل زمانہ بڑا نازک ہو گیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے لوگوں کے خیالات اور طرزِ عمل میں انقلاب آ گیا ہے۔ اب کوئی تحکم یا مشیّت برداشت نہیں کرتا۔ گزارہ جبھی ہوتا ہے اگر آدمی کسی کے ساتھ مخلصانہ ہمدردی کرے اور اُس کے غموں میں شریک ہو۔ کوئی سینے پرونے کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کرو۔ اس سے عورتیں تمہاری مطیع رہیں گی۔

داری[1] عابد ابھی تک کیوں جلال پور نہیں پہنچے۔ کیا اب مکمل طور پر ترک وطن کر دیا ہے ان ایام میں تو وہ ہمیشہ آ کر اپنا حصہ لیا کرتے تھے۔

حامد سلمہ اور شہناز بی بی کو دعوات

علی عباس

---

[1] مقامی افراد جو زمین کی فصل میں حصہ دار تھے۔

ملتان

بیگم السلام علیکم!

میں بفضلہ بخیر وعافیت یہاں پہنچ گیا تھا۔ مکان چھوڑ دینے کے باعث اچھی خاصی دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے۔ تلاش جاری ہے لیکن تا حال کوئی مکان نہیں مل سکا۔ شاید ان دنوں میں کامیابی ہو جائے۔

میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج لائل پور ہو گیا تھا لیکن پرنسپل صاحب نے رکوا دیا ہے۔ وہ میرے یہاں سے جانے پر راضی نہیں ہیں۔ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ ناراض نہ ہو جائیں۔

اپنے حالات سے مفصل آگاہ کرنا۔ حامد میاں سکول جاتے ہوں گے اور امید ہے کہ گھر میں آ کر باقاعدہ کام بھی کر رہے ہوں گے۔ بی بی جان[3] کو بھی قاعدہ منگا کر کچھ نہ کچھ کراتی رہنا اور حامد کو حساب کا کام باقاعدگی سے کرانا۔

حامد، گل[1] اور منے میاں[2] کو دعوات۔

آمنہ کس رنگ میں ہے؟ اس کو بھی پوچھنا

علی عباس

---

[1] گل شگفتہ

[2] جعفر رضا

[3] امی جان کے ساتھ رہنے والی بی بی۔

بیگم السلام علیکم!

ابھی تک میرے تبادلے کا کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ لاہور سے اطلاع آئی تھی کہ میرا تبادلہ لائل پور ہو گیا ہے۔ وہاں سے کوئی صاحب یہاں آنا چاہتے ہیں اُن کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ مگر ابھی تک احکام نہیں آئے۔ حکم آنے پر پرنسپل صاحب سے دوبارہ بات ہوگی تو میں اپنی مشکلات بیان کر کے اُن سے اجازت لینے کی کوشش کروں گا۔ حکم کا انتظار ہے اور یہاں کے قیام کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ یہاں رہنا پڑ گیا تو کوئی اچھا مکان لینے کی کوشش کروں گا تاکہ تم لوگوں کو یہاں بلا سکوں۔ بالفعل ایک ایسے مکان میں رہتے ہیں جو پہلے مکان کا چھوٹا بھائی ہے۔ فرش کچا، بجلی ندارد، غسل خانہ ندارد، کالج کے بالکل قریب ہے۔ عارضی طور پر لیا ہے۔ میرے تبادلے کا قطعی فیصلہ ہونے کے بعد دیکھا جائے گا۔

بھائی بھیجا کی علالت کا افسوس ہوا۔ اس کی ہر ممکن تیمارداری کرنا۔ اس کا ہم پر حق ہے اور ہمارا اخلاقی فرض بھی ہے۔ مجھے بھی اس پر گلہ ہے کہ میں مہینہ بھر جلالپور بیمار پڑا رہا اور اس نے آ کر خبر نہ لی۔ کیا اپنوں کو آدمی بھیج کر مزاج پرسی کے لیے بلایا جاتا ہے۔ فرامرز خاں کی زبانی اس نے ضرور سن لیا ہو گا۔ بہر حال اگر وہ تمہارے پاس رہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کرنا کہ ہم تمہیں جو اپنے پاس رکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے کام نہیں چل سکتے بلکہ مدعا یہ ہے کہ تمہاری خدمت کر سکیں اور اپنا فرض ادا کریں۔ ویسے وہ اگر میرے گھر کو اپنا گھر سمجھے تو تھوڑا بہت کام کرنے میں کیا عار محسوس کی جا سکتی ہے۔

بیوی ملانی کے متعلق تمہارا خیال کچھ ہو ظاہر اُبگاڑنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار برملا کرنا کیا ضروری ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ مہر بھری کو کبھی کبھار سالن وغیرہ دے دیا کرو۔ وہ تمہارے کئی کام سنوار دے گی یا کم سے کم تمہارے پاس آ بیٹھے گی۔ ہم لوگوں کو ان سے برابر کی لاگ ڈانٹ رکھنا بے سود ہے اور ان کے باہمی جھگڑوں میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔ امینہ کے ساتھ بھی یہی پالیسی اختیار کرو۔ خواہ کیسی لاعلاج ہے تمہارے کام تو تھوڑے بہت کر ہی دیتی ہے اور اگر بالکل ہی کہنے میں نہ رہے تو رخصت تو ایک لمحہ میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ بہر حال الجھنے اور ڈانٹنے کی بجائے اُسے مشفقانہ انداز میں سمجھاؤ گی تو وہ اثر قبول کرے گی اور اگر تمہارا رویہ مشفقانہ ہو گا تو گھر سے بھی اُسے دلچسپی ہوگی۔ ہر وقت کی ڈانٹ اور لعنت ملامت سے تو سب دور بھاگتے ہیں۔ کبھی کبھار بیوی ملانی کے ہاں چلی جائے تو مضائقہ نہیں لیکن وقت بے وقت اور ہر وقت کا اس کا وہاں جانا اچھا

نہیں ہے۔ یہ بات اسے مری زبانی سمجھا دینا۔ اس کا کوئی کپڑا پھٹ گیا ہو تو لے دینا۔

حامد کو اپنے پاس بٹھا کر سوال نکلوایا کرو۔ چیسوں، آٹوں، دونیوں اور دوسرے سکوں کا اسے تصور نہیں ہے۔ پیسے، آنے، روپے وغیرہ اس کے سامنے رکھ کر کھیل کھیل میں بتایا کرو کہ اتنے آنے ہوں تو دونی، چونی یا روپیہ بنتا ہے اور اٹھنی میں اتنے پیسے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حامد، بی بی جان[5] اور جعفر کو بہت بہت پیار۔ بی بی جان کو اکثر اپنے پاس ہی رکھنا۔ اس کا اب زیادہ ادھر ادھر پھرنا مناسب نہیں ہے۔

ممانی پھجاں اور امینہ کو پوچھنا۔

علی عباس

نوٹ: بیگم! کمہارن[6] سے معلوم کر کے لکھنا کہ اُن کے پرچے کی کسی نے تفتیش کی ہے یا نہیں۔ کی ہے تو مفصل حالات لکھنا کہ کیا کچھ ہوا ہے۔

ممانی پھجاں: ابا جان کے ماموں ہدایت خان کی بیگم اور بچے طاعون کی وبا پھوٹنے سے اس مہلک مرض کا شکار ہو گئے۔ ہدایت خان نے طویل عرصہ دوسری شادی نہ کی پھجاں (فاطمہ بی بی) ان کی خدمت گزار تھیں۔ بعد ازاں ہدایت خان نے ان سے عقد کر لیا۔ ہدایت خان کی وفات کے بعد ممانی پھجاں نے نالش کر دی اور شوہر کی زمین میں سے حصہ مانگ لیا۔ مقررہ تاریخ پر عدالت نہ پہنچ سکیں اور یوں عدالت نے یہ مقدمہ خارج کر دیا۔ ابا جان انہیں پاس رکھ کر خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے مگر وہ ناراض رہیں ان کا خیال تھا کہ شاید کام کاج کروانے کی غرض سے پاس رکھنا چاہتے ہیں سو وہ آتی جاتی تو رہتیں مگر مستقل پاس قیام پذیر نہ ہوتیں۔

۲۔ فرامرز خاں: ابا جان اور امی جان کے ننھیالی عزیز تھے۔

۳۔ بیوی ملاحی اور مہر بھری پڑوس میں رہنے والی خواتین تھیں۔

۴۔ امینہ مستقل پاس رکھی ہوئی لڑکی تھی۔

۵۔ بی بی جان: باجی گل شگفتہ کو دیہات میں بی بی جان کہا جاتا تھا۔ سادات کی نوجوان لڑکیوں کا نام لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

۶۔ پڑوسن کمہارن کی چوری ہوئی تو تھانے میں والد صاحب کی وساطت سے ایف۔ آئی۔ آر کٹوائی تھی۔

ملتان

بیگم السلام علیکم!

افسوس کہ چند در چند مصروفیات کے باعث تمہارے خط کا جواب جلدی نہیں لکھ سکا۔ آج کل کالج کا کام زوروں پر ہوتا ہے اس لیے وقت کم ملتا ہے۔ آج تمہارا مرسلہ سویٹر بھی پہنچ گیا ہے۔ بچوں کے سویٹروں میں سفید رنگ نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے تو پسند نہیں آیا۔ البتہ حامد خرگوش دیکھ کر بہت خوش ہوا ہے۔ میں نے اُسے اپنی رائے سے مطلع نہیں کیا۔

مکان کی زیادہ مرمت کرانے کی بالفعل ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ بشرط زندگی تعطیلات گرما میں یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ ہاں سیڑھیوں کی لیپ ضروری ہے۔ اگر ساری سیڑھیوں کی لیپ نہ ہو سکے تو سلوں کے نیچے جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں اُن کے سامنے لیپ بہت ضروری ہے۔ ان کو بارش سے نقصان ہونے کا احتمال ہے۔ اس مقصد کے لیے جو سیمنٹ میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ کافی ہے۔ ریت کے دو ایک تسلے کافی ہوں گے اور مستری گوڑ کی آدھے دن کی مزدوری ہو جائے گی۔

دادی سجادے[1] صاحبہ کا سامان سنبھال کر کوٹھڑی میں محفوظ کر دینا۔ ایک چیز اِدھر سے اُدھر ہو گئی تو میری شامت آجائے گی۔

عزیز حامد باقاعدہ سکول جانے لگا تھا۔ مگر پرسوں سے بے چارے کو بخار نے آدبایا ہے۔ نزلہ اور کھانسی کی شکایت بھی ہے۔ ڈاکٹری علاج جاری ہے اُمید ہے کل تک مکمل افاقہ ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔

یہاں کی گرد اور موسم کی تبدیلی سے سب کے گلے خراب ہو رہے ہیں۔

بوڑھی نوکرانی کو پانچ روپیہ ماہوار دینا کر لو یا اس سے زیادہ جو مناسب ہو۔ کپڑے بھی لے دینا ضروری ہیں۔ پانچ روپے ماہوار دینے میں کسی لڑکی کا انتظام بھی ہو سکتا ہے لیکن بڑھیا غنیمت ہے۔ جہاں وقت گزارنا ہو وہاں خرچ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ نوراں اور برکت کی مزاج پرسی کرنا۔

نواب صاحب[2] کے بیٹوں کی شادیاں کب قرار پائی ہیں۔

میری طبیعت بفضلہ اب اچھی ہے۔ علاج پر خرچ بہت ہو گیا ہے خیر صحت اور زندگی رہی تو بھول جائے گا۔ صغراء[3] کو پوچھنا۔

فقیر عباس

---

[1] دادا جان کی پھوپھی زاد بہن۔ [2] دادا جان کے کزن۔ [3] پڑوس کی بزرگ خاتون

ملتان

[illegible] اپریل

ڈیئر بیگم السلام علیکم!

میں اور حامد بفضلہٖ بخیر و عافیت یہاں پہنچ گئے تھے۔ حامد کو کھانسی کی شکایت ابھی تک ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ انشاءاللہ رفع ہو جائے گی۔ اس کے شفایاب ہونے پر سکول میں داخل کرایا جائے گا۔ وہ خوش باش ہے، مطمئن ہے۔ تمہاری تنہائی کا فکر رہتا ہے۔ رات کو ضرور کسی نہ کسی کو ساتھ رکھنا اور نہیں تو مہر بھری کو ہی کہنا۔ برکت اگر رات کو آ جائے تو بہتر ہے۔ مکان کے سب تالے اچھی طرح لگا دینا۔ ملاحوں کی طرف ڈیوڑھی ہے۔ اس کا دروازہ اچھی طرح بند کروا دینا۔ میں انشاءاللہ یکم کو روپیہ بھیجوں گا۔ ایک روپیہ حسو کو دینا ہے۔ دو روپے دس آنے نوراں کو اور ایک روپیہ زائد۔

بی بی جان کے لیے دل اداس ہے۔ حامد بھی امی اور بی بی جان کو یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ کہاں چلی گئی ہیں۔ ایک دن رات کو سویا ہوا بھی امی جان، امی جان کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے پاس لٹا لیا۔ سبق بھی پڑھنے لگا ہے اور کل سے لکھائی بھی شروع ہو جائے گی۔ گرمی بہت سخت پڑنے لگی ہے۔ اختر اور حامد کی طرف سے آداب۔ بی بی جان اور جعفر سلمہ کو دعوات۔

تمام حالات مفصل لکھنا تاکہ اطمینان ہو۔

فقیر

حسو: والد گرامی کا خدمت گار۔

نوراں: درزن تھی۔ گھر میں کام کاج بھی کر دیتی اور اوپر کے کام بھی کر دیتی تھی۔

حامد: حامد رضا کو چار برس کی عمر میں امی جان نے ابا جان کے ساتھ ملتان بھیج دیا کہ اس کی پڑھائی لکھائی شروع کرا دی جائے۔ گاؤں کا ماحول سوائے کھیل کود کے اور کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔

اختر: پھوپھی جان زہرا کے بڑے بیٹے، جو والدین کی وفات کے بعد دادی جان کی خواہش کے بموجب ابا جان نے ان کی سرپرستی قبول کر رکھی تھی۔

بیگم! السلام علیکم

حامد سلمہ کو واقعی کالی کھانسی کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم دونوں کی یہی تشخیص ہے۔ راتیں عموماً جاگ کر گزارتے ہیں۔ دن کو آرام رہتا ہے لیکن جب رات کو کھانسی شروع ہوتی ہے تو بڑی تکلیف رہتی ہے۔ بے چارے کا سانس اکھڑ اکھڑ جاتا ہے۔ میں اُسے گود میں لے کر بیٹھا رہتا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ اپنی معیاد پوری کر کے جائے گی۔ حکیم صاحب کا علاج شروع ہے اور قدرے افاقہ ہے۔ آج پھر ایک اور ڈاکٹر کو دکھانے کا ارادہ ہے جو بچوں کی امراض کا ماہر خصوصی ہے۔ حیلاں بھی خط لکھا تھا کہ بابو لال دین سے کوئی نسخہ دریافت کر کے لکھ بھیجیں۔ جواب کا انتظار ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ تم مجھ سے استصواب کیے بغیر اشتیاق سلمہ کی مزاج پرسی پر چلی گئیں حالاں کہ میں تمھیں واضح طور پر منع کر آیا تھا اور محض چند کام لینے کے لیے اس قدر بے تکلفی پیدا کر لی کہ اُن کا نوکر بھی تمہارے گھر آنے لگا۔ میں نے اسی لیے تمھیں وہاں جانے سے منع کیا تھا کہ ان کو آمد و رفت کا بہانہ نہ مل جائے۔ جس کو میں ناپسند کرتا ہوں۔ تم نے شاید تہیہ کر لیا ہے کہ میرے احساسات کا کبھی پاس نہ کرو گی اور جس بات کو میں ناپسند کروں اس کو ضرور کرو گی۔ خدا معلوم میرے صبر و حوصلہ کی کتنی آزمائش ابھی باقی ہے۔

میں نے بھیجاں کو چٹھی لکھ دی ہے اُمید ہے کہ وہ عنقریب جلال پور پہنچ جائے گی۔ ہمیں جون کے نصف میں چھٹیاں ہو جائیں گی۔

حامد کی طرف سے سلام، بی بی جان اور جعفر کو پیار۔

فقیر

عباس

امی جان غالباً تنہائی کا شکار تھیں اور کہیں آمد و رفت بھی نہ تھی اسی لیے وہ ابا جان کے عزیز و اقارب کے ہاں کسی موقع پر چلی جائیں۔ یا کوئی کام ان سے کہہ دیتیں مگر ابا جان کو یہ گوارا نہ ہوتا۔ امی جان دو ننھے بچوں کے ساتھ مشکل حالات میں گزر اوقات کر لیا کرتیں۔ گھر کی مرمت بھی گاہے گاہے خود ہی دیکھ لیا کرتیں۔ مگر ابا جان کو ان کی فکر دامن گیر تو رہتی مگر ان سوتیلے عزیزوں سے بے تکلفی یا آمد و رفت ان پر سخت شاق تھی جس کا اظہار خط سے مترشح ہے۔

گوجرانوالہ

ستمبر

بیگم !السلام علیکم!

تمہاری چٹھی آج ملی۔ اُمید ہے کہ میرا خط بھی پہنچ گیا ہو گا۔ میں نے ابھی ابھی ایک سو روپیہ بذریعہ تار منی آرڈر بھجوا دیا ہے۔ اس پر مسز علی عباس لکھا ہے۔ اُمید ہے کہ آج مل جائے گا۔ نہیں تو ڈاک خانے سے پتہ کرانا۔ ممکن ہے مسز علی عباس کی انہیں سمجھ ہی نہ آ سکے۔ بہر حال میں آج کل جعفر کے داخلے کے لیے سرگرداں ہوں۔ یہاں کے گورنمنٹ ہائی سکول سے اُس کے کاغذات داخلہ مکمل کرائے ہیں۔ اب لاہور جاؤں گا وہاں سے انسپکٹر کی تحریری اجازت ہو گی تب داخلہ ہو سکے گا کیوں کہ جعفر اب تک الکوٹ سکول میں پڑھتا رہا ہے۔ بڑی حیرانی ہوئی ہے۔ عرس قریب آ ہی گیا ہے۔ دیکھ کر آ جانا۔ میرا آنا بہت مشکل ہے۔ مجھے لاہور کا چکر ان دنوں لگانا ہے۔ جہلم تک کسی کو ضرور ساتھ لانا۔ سوار کرا جائے گا۔ حبیب یا لال کو کہنا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ مرمت کا کام حسب منشا ختم ہو گیا ہے۔ گل شگفتہ اور رخی کو دعائیں۔ ممانی کو سلام علیکم

عباس

رخی: لالہ رخ کو پیار سے رخی کہتے تھے۔

حبیب: اوپر والی گلی میں پڑوس میں رہتا تھا۔ والدِ گرامی کے ملبوسات وہی استری کیا کرتا تھا۔

لال: نیچے والی گلی میں پڑوس میں تھا اور جب پانی کا انتظام بذریعہ پائپ نہیں تھا تو اس کی بیٹیاں ہمارے گھر گھڑوں میں پانی بھر کے لایا کرتیں۔ اس کی بیوی تندور پر روٹیاں لگاتی تھی۔ اس کی ایک بیٹی کی پرورش ہمارے گھر لاہور میں ہی ہوئی اور ...ل جان نے اس کی شادی جلال پور میں کر دی۔

(۱۷) گوجرانوالہ

۱۹۔ کتوبر ۶۵ء

بیگم! السلام علیکم

تمہارا مکتوب مل گیا تھا۔ آج تمہاری چٹھی بنام حامد بھی موصول ہو گئی ہے۔ جنگ دوبارہ نہیں چھڑی۔ یہ بے بنیاد افواہ کس نے اُڑادی ہے۔ کشمیر میں جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے محاذوں پر امن ہے۔ البتہ دوبارہ چھڑ جانے کا امکان ضرور موجود ہے کیوں کہ بھارت کسی صورت کشمیر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ یو۔ این۔ او کے مبصر جنگ بندی کے محاذ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ حالات اسی طرح رہے تو شاید ۱۱۵ کتوبر کو سکول اور کالج کھل جائیں ابھی تو بند ہیں۔ میں گذشتہ منگل کے دن حیلاں تعزیت کے لیے گیا تھا۔ سب لوگ خیریت سے ہیں۔ سکول کالج کھل گئے تو تم لوگوں کو بھی یہاں بلا لیں گے۔ ہوسٹل بند ہونے کے باعث فضل کو گذشتہ چھٹیوں کی تنخواہ دلا کر جلالپور بھجوادیا تھا۔ اُس کے ہاتھ چاول، تیل سویٹر اور گرم چادر بھی بھجوادی تھی۔ اُن کی رسید کا تم نے کوئی ذکر نہیں کیا جس سے تشویش ہوئی۔ بواپسی اطلاع دینا۔ روپے کل منی آرڈر کرادوں گا۔ گل اور رُخی کو دعوات۔ انہیں کہنا کچھ نہ کچھ پڑھتی رہیں۔ حامد۔ جعفر سے آداب۔

عباس

(۱۹) گوجرانوالہ

۴۔ جون ۶۶ء

بیگم! سلام مسنون

تمہاری چٹھی ابھی ابھی ملی ہے۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ ایک اخبار نویس کی طرح شادی کی مکمل رپورٹ لکھ کر مجھے بھیج دیتیں تاکہ میں بھی محظوظ ہو سکتا۔ بہر صورت زبانی سہی۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ تم لوگ خیر و عافیت سے جلالپور پہنچ گئے ہو۔ یہاں دو دفعہ بارش ہوئی جس سے بڑا حبس ہو گیا ہے اور بھادوں کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کالج ۴ جولائی کو بند ہو جائے گا لیکن مجھے دو تین ہفتے رہنا پڑے گا کیوں کہ میں ایف۔ اے کے ایک پرچے کا صدر ممتحن ہوں اور مجھے پانچ سو سے زیادہ پرچے جانچنے پڑیں گے۔ ابھی تک پرچے آنے شروع نہیں ہوئے۔ اس کام سے فراغت پاتے ہی انشا اللہ عازمِ جلال پور ہوں گا۔ تمہارے کہنے پر میں نے ''امروز'' کا ایک ماہ کا چندہ بھجوا دیا ہے۔ پانچ سات دنوں تک اخبار جاری ہو جانا چاہیے۔ تصویروں والی کہانی کے تراشے گل اور جعفر کی تفریحِ طبع کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اب سنو''قصہ مرغیوں کا'' سرخ چوزہ تو اسی دن شام کو قریب المرگ ہو گیا تھا۔ شفیع نے اسے ذبح کر کے کھایا۔ دوسرے دن سفید چوزہ کی حالت بھی غیر ہو گئی چنانچہ وہ بھی ذبح کر دیا گیا اور نوکروں کے دوزخ شکم کا ایندھن بن گیا۔ لڑاکا چوزہ باقی رہ گیا ہے اور اسے ماں نے مارنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بے چارا اس کے آگے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ میں انہیں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کھلایا کرتا ہوں اور ہاں زخمی کی مرغیوں نے بھی انڈے دینا شروع کر دیے۔ کل مُرغی نے غسل خانے میں گھس کر ایک بہت ہی ننھا سا انڈا دیا۔ سات آٹھ انڈے جمع ہو گئے تھے نوکروں کو دے دیے ہیں کہ ان کی رکھوالی بھی وہی کرتے ہیں۔ باقی مرغیاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ چوزوں والی مرغی اب خوب ہٹی کٹی ہو گئی ہے اور پر پُرزے نکال رہی ہے۔

اس مہینے کی تنخواہ چار پانچ تاریخ کو ملے گی۔ ایک صد روپیہ منی آرڈر کرا دوں گا۔ امید ہے کہ سب لوگ باہم محبت اور صلح آشتی سے رہتے ہوں گے اور زخمی بیگم کو رُلاتے نہیں ہوں گے۔ حامد اور جعفر کو تاکید ہے کہ وہ بارش ہونے پر ''منجھ یا ڈھسن یا گھنڈر'' میں نہانے کو نہ جائیں کہ خطرہ ہوتا ہے۔ حامد کا نتیجہ جولائی کے آخری ہفتے یا اگست کے شروع میں آئے گا۔ اس کا رول نمبر لکھ بھیجنا۔ مجھے بھول گیا ہے۔ حامد، گل،

جعفر، رخی کو بہت بہت پیار۔

ملتان سے ایک کارڈ آیا تھا وہ بھی بھیج رہا ہوں۔

علی عباس

شفیع: ہوسٹل کے کچن کا خانساماں تھا۔ چنے کی دال خاص طور پر نہایت لذیذ بناتا تھا۔

بُھو: تالاب، جو بارش سے بھر جاتا۔ گاؤں کی عورتیں وہاں کپڑے دھونے جایا کرتیں۔

ڈھن: پہاڑ کے نیچے بڑا گڑھا جو پانی سے بھر جاتا۔ انجان لوگوں کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ابا جان بتایا کرتے تھے کہ ایک بار وہ گھوڑے پر سوار بارش میں کہیں جا رہے تھے کہ پیچھے سے ایک شخص نے چلا کر کہا، "سوار!! آگے نہ جائیں۔ آگے ڈھن ای"

ابا جان کہتے ہیں اس دن وہ موت سے ایک قدم کے فاصلے پر رک گئے تھے۔

گھنڈر: شدت کی بارش کے بعد پہاڑوں سے زور شور سے برساتی نالہ بہتا ہوا آتا ہے اور دریائے جہلم میں جا گرتا ہے۔

گوجرانوالہ

۵۔ ستمبر

بیگم! السلام علیکم!

پہلا خط پوسٹ کرنے کے بعد خیال آیا کہ تم اُسے پڑھ کر کہیں گھبرا نہ جاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دشمن نے ڈسکہ (سیالکوٹ ضلع) جسر اور لاہور پر حملہ کر دیا ہے لیکن ہمارے جوان اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں سخت جنگ چھڑ گئی ہے۔ فتح انشاءاللہ ہماری ہی ہو گی۔ ہمارے فوجی نہایت شجاعت اور پامردی سے لڑ رہے ہیں۔ کسی قسم کی تشویش نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ حافظ و ناصر ہیں۔ آرام سے جلال پور قیام رکھنا۔ حالات روبراہ ہونے پر میں جا کر تمہیں لے آؤں گا۔ ویسے تم بہتری سمجھو تو جیلاں چلی جانا۔ اب تمہارا یہاں آنا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ بم باری کا خطرہ ہر وقت مسلط۔ آج کی بم باری میں چھ آدمی مارے گئے ہیں۔ حامد اور جعفر بخیریت ہیں اور یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتے۔ کسی قسم کا فکر نہ کرنا گل اور رُخی کو دعائیں، مامی کی مزاج پُرسی کرنا۔

دعا گو

عباس

انہی دنوں خطرات سے نمٹنے کے لیے ابا جان نے پستول خریدا اور اس کا لائسنس بھی بنوایا۔ یہ پستول ہنوز حامد بھائی جان کے پاس محفوظ ہے۔

۱۵۔ اکتوبر

بیگم! السلام علیکم!

لڑکوں اور لڑکیوں کے کالج اور سکول ۱۸ اکتوبر (بروز سوموار) کو کھل رہے ہیں۔ حالات اعتدال پر آ گئے ہیں۔ کالج ہوسٹل بھی ۱۸ اکتوبر سے کھل جائے گا۔ تم فضل کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤ۔ فضل کو پھر نوکری پر لگا دیا جائے گا۔ یہ خط ملتے ہی روانہ ہو جانا۔ چابی میاں سے کھلوا لینا اور اُسے لحاف بھی دینا اور کہنا کہ پہلے کی طرح سویا کرے۔

شمیم[۲] کے والد صاحب وزیر آباد میں فوت ہو گئے ہیں۔ میں تعزیت کے لیے گیا تھا۔

عزیزان بخیریت ہیں۔ عزیزیوں کو دعوات۔

علی عباس

میاں: خدا بخش نام تھا اور ہمارے گھر کی قریبی مسجد میں موذن و امامت کے فرائض بھی ادا کیا کرتے تھے۔
شمیم: ماموں جان اکمل کی بیگم یعنی امی جان کی بھابی محترمہ

(۲۱) سعید منزل

نسیم پارک، ساندا اردو۔ لاہور

۱۲۔ ستمبر ۱۹۷۱ء

بیگم! السلام علیکم!

تمہارے خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ فنڈ اور پنشن کا چکر شروع ہے۔ کلرک بادشاہ کوئی نہ کوئی الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ بہر حال انشاء اللہ اپنے وقت پر کام ہو ہی جائیں گے۔

عزیزہ گل کو میو ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا ہے جو گلے کے امراض کا ماہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکتوبر میں اس کا اپریشن کروں گا۔ اس سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی بدنی حرارت (ٹمپریچر) رفع ہو جائے۔ اُسے مناسب دوائی دی جارہی ہے لیکن ۹۹ تک حرارت ہو ہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ گلے ہی ہیں۔ اُمید ہے کہ اکتوبر تک ٹمپریچر رفع ہو جائے گا۔ اس حالت میں اُس کا جلال پور جانا مناسب نہیں ہے۔ عزیز حامد کے پرچے ختم ہو گئے ہیں اور زبانی امتحان بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہ جلال پور جانے کے لیے پَر تول رہا ہے۔ کسی دن چل ہی دے گا۔ جعفر اور رُخی باقاعدگی سے سکول جانے لگے ہیں اور ٹھیک ہیں۔

میں تمہارے آنے کے بعد ہفتہ عشرہ کے لیے جلال پور جاؤں گا اور تمام معاملات کی دیکھ بھال کر لوں گا۔ آتی دفعہ اوپر کی ڈیوڑھی اور چوباروں کی چابیاں ساتھ لیتی آنا۔ میاں کو نہ دینا۔

مامی بھیجاں۔ برکت اور عائشہ کی مزاج پُرسی کرنا۔ سنا ہے کہ مامی بہت کمزور ہو گئی ہے اب اُس کا کیا حال ہے۔

فقط

علی عباس

برکت: کھوتے والی مائی صاحب کے گھر کی نگران تھی جو روضہ شریف سے متصل تھا۔ آخری دم تک وہ اس گھر کو سنبھالے رہی۔ ہمارے یہاں اس کا آنا جانا رہتا تھا۔

عائشہ: عائشہ کے باپ نے اپنی شادی کے لیے عائشہ کو اپنے سے بڑی عمر کے زمین دار سے بیاہ دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد نے عائشہ کو گھر سے بے دخل کر دیا۔ بے چاری نیم دیوانی یہاں وہاں پھرتی اور اپنا جہیز چھینے جانے کا قصہ سناتی رہتی۔

لاہور

۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء

بیگم! السلام علیکم

جعفر پہنچ گیا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں اُس کا داخلہ ہو گیا ہے۔ سوموار کو فیس دے دی جائے گی۔ کالج یکم اکتوبر کو کھلیں گے۔ جعفر کی زبانی تمہاری علالت کا علم ہوا کہ اب دورے[1] زیادہ سخت پڑنے لگے ہیں۔ یہ معلوم کر کے مجھے ایک گونہ تشویش ہوئی۔ تم جلدی یہاں چلی آؤ تا کہ مناسب علاج کرایا جا سکے۔ میں نے ایک خط حامد کو بھی لکھا تھا کہ اب یہاں آ جاؤ۔ لپائی کے لیے نہ بیٹھے رہو۔ بارش کا موسم گزر رہی چکا ہے۔ میں چند دنوں تک جلال پور جاؤں گا تو لپائی کرا دوں گا۔ میری طبیعت بھی دو دن ناساز رہی۔ شب برات پر گڑ کا حلوا کھا لیا جس سے درد ہو گیا۔ بحمد اللہ آج افاقہ ہے۔ گل اور رُخی خیریت سے ہیں اور آداب عرض کہتی ہیں۔

آتی دفعہ بڑے دروازے کے (باہر کا جو مشرق کی جانب کھلتا ہے) تالے کی چابی لال جھیور کو دے آنا اور اُسے کہنا رات کو ایک آدھ دفعہ دیکھ لیا کرے گا۔ تمہارے آنے کے بعد میں جلال پور جاؤں گا تو مستقل انتظام ہو جائے گا۔ چند دنوں کی بات ہے۔ حامد کو دعوات اور مضمون واحد۔

طالب خیریت

علی عباس

پس نوشت: شمالی چوبارے میں ایک پرانی وضع کی الماری ہے۔ اس میں پرانی کتابیں رکھی ہیں۔ ان کتابوں میں ایک طب کی قلمی کتاب جو نہایت خوبصورت کتابت کی گئی ہے۔ وہ سب سے خوبصورت کتاب ہے۔ حامد سے کہنا وہ کتاب لیتا آئے گا۔

[1] امی جان کو مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ابا جان نے راولپنڈی بڑے داماد ساجد حسین کے توسط سے انہیں ایک کرنل ڈاکٹر کو دکھایا۔ جس نے دوا تجویز کی۔ یہ دوا مستقل کھانا پڑی۔ اس دوا کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

(۴۳) لاہور

۱۴۔ اکتوبر

بیگم! السلام علیکم!

خط تمہارا ملا۔ گل کے آپریشن کے متعلق صورت یہ ہے کہ جس ڈاکٹر کو دکھایا تھا وہ آپریشن کا مشورہ دیتا ہے اور وہ گلے کا ماہر ہے۔ دوسرے ڈاکٹر اور حکیم کہتے ہیں کہ دوائی کرتے رہیں گلے خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ دوا کے استعمال سے اب اُسے بخار نہیں ہوتا لیکن گلے کو کلّی شفا بھی نہیں ہوئی۔ آپریشن کا فیصلہ تمہارے آنے کے بعد ہو گا۔

تم نے لکھا ہے کہ میں رمضان سے پہلے آؤں گی تو رمضان میں کون سے دن باقی رہ گئے ہیں۔ میں انشاء اللہ رمضان کے بعد دس بارہ دن کے لیے جلال پور جاؤں گا۔ تم بچوں کے ساتھ رہنا۔ یہ ابھی ہمارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپس میں لڑتے ہیں۔ جب میں ایک رات کے لیے ڈنگہ گیا تھا تو بے چارے رات بھر جاگتے رہے اور ڈرتے رہے۔

جنگ کا خطرہ ضرور ہے لیکن بڑی طاقتیں جنگ رکوانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کل صدر یحیٰی خان نے بھی اپنی تقریر میں جنگ کے خطرے کا ذکر کیا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں بس تیار رہنے کی ضرورت ہے۔ بالفرض جنگ ہوئی بھی تو آخر لاہور کے بیس لاکھ باشندے کہاں جائیں گے۔ کیا لاہور سے بھاگ کر جلال پور جانے والوں کو موت نہیں آئے گی۔ یہ بھی تو نامناسب ہے کہ ذرا جنگ کے آثار پیدا ہوں اور آدمی گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یہ اندیشے امیروں کو ہوتے ہیں جن کے پاس وافر دولت ہے۔ ہمارے پاس کیا ہے جو لٹ جائے گا؟ خدانخواستہ لاہور فتح ہو گیا تو پاکستان بھی ختم ہو جائے گا۔ ہماری فوج کسی قیمت پر بھی دشمن کو لاہور میں گھسنے نہیں دے گی۔ ہاں، بمباری ہوئی تو اتلاف جان و مال ہو گا۔ اس میں دوسرے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ ہم بھی ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ بم ہم پر ہی گرے۔ یہ باتیں تمہارے پوچھنے پر لکھ رہا ہوں ویسے میرا خیال ہے کہ ہندو حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ گیدڑ بھبکیاں دے کر دوسری قوموں سے بے گھر لوگوں کے نام پر مال بٹورنا چاہتے ہیں۔ ملنے جو شہرے۔

اصغر شاہ کا خط آیا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے کہ اُسے بیماری سے افاقہ ہے اور ممیجاں کو اس نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

آتی دفعہ تالے وغیرہ مضبوطی سے لگا کر آنا اور چابی لال کے سپرد کر آنا۔ اگر وہ آمادہ نہ ہو تو پھر بامر مجبوری میاں کو ہی دے آنا۔ البتہ چوباروں کی چابیاں اور ڈیوڑھی (اوپر والی) کی چابی لیتی آنا۔

عزیز حامد کو ممنون واحد۔ اکمل خاں[2] کل آیا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ تمہارے بڑے بھائی افضل خاں اپنی تمام اراضی بیچنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

گل، رخی اور جعفر سلام عرض کرتے ہیں۔ جعفر صاحب آج کل بڑے بڑے فوجی بوٹ "کھینچتے"[3] پھرتے ہیں۔

فقط

علی عباس

نئی خبر[4] یہ ہے کہ ٹائلہ اور کالو لندن سے واپس یہاں پہنچ گئے ہیں۔ پڑوس میں قہقہوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ دیکھیں گالیوں کا ہنگامہ کب شروع ہوتا ہے۔

۱۔ سید علی اصغر: ابا جان کے چھوٹے بھائی۔ عمر بھر شادی نہیں کی۔ ڈنگہ نزد کھاریاں ہی میں مقیم رہے۔ زمین کی آمدنی کے علاوہ حکیمی نسخوں کے مطابق گھوڑوں کی ادویات (گولیوں کی صورت میں) بنوا کر فروخت کرتے جن کی بڑی مانگ تھی۔ گزر اوقات خوب ہو جاتی۔ ابا جان ان کی خبر گیری کرتے رہتے۔ دادی جان کی وفات کے بعد تنہا رہ گئے۔ بعد ازاں سید حامد رضا اور سید جعفر رضا گاہے بگاہے ان کی خبر گیری کرتے رہتے۔ پسندیدہ کھیل شطرنج تھا۔ دونوں بھائی اس کھیل میں ماہر تھے۔ ابا جان بھی عمدہ کھیلتے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ جعفر بھائی کا پلہ اکثر بھاری پڑ جاتا۔ چچا جان ڈنگہ سے میٹھی سفید سونف، مغزیات ڈال کر بنایا گیا گڑ ہمیشہ ہمیں بھجوایا کرتے۔ جب ہم جلالپور منتقل ہوئے تو وہاں بھی کبھار چکر لگا جایا کرتے۔ وفات سے چند دن قبل حامد بھائی انہیں جلالپور شریف لے آئے۔ ابتدا میں افاقہ ہوا مگر تین دن بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ پھوپھی جان زہرہ کی وفات کے بعد ان کے شوہر تھا نیدار بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جس کے بعد ان کے چار بیٹے دادی جان کی خواہش پر ڈنگہ بھی کچھ عرصہ رہے۔ دادی جان بھی ڈنگہ میں مقیم رہیں۔ چچا جان نے ان بچوں کی پرورش بھی کی غالباً اسی وجہ سے انہیں شادی یا اپنی اولاد کا خیال نہ آیا۔ دادی جان نے اُن کی ایک جگہ منگنی بھی طے کر دی مگر چچا جان نے انکار کر دیا۔

۲۔ اکمل خان امی جان کے چھوٹے بھائی تھے جبکہ افضل خاں بڑے بھائی تھے۔ ماموں جان افضل کسٹمز میں افسر تھے اور کسٹمز کی طرف سے ہاکی کے کپتان بھی رہے۔ ان کے گھر میں ایک کمرہ ٹرافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میڈلز اور سرٹیفکیٹس کا تو کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ ان کے بچے بھی لائق تھے خاص طور پر غزالہ جو فرسٹ ویمن بینک میں اعلیٰ افسر ہیں۔ ماموں جان افضل روشن خیال اور منصف مزاج انسان تھے۔ انہوں نے خالہ جان حمیدہ کو مختلف امور سے آگہی کے لیے پیسے بھی بھجوائے۔ وہ چاہتے تھے کہ نانا جان کی جائیداد میں سے تمام بہنوں کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔ تمام بھائی ان کے ہم خیال نہیں تھے مگر اُن کی کاوشوں سے امی جان اور دیگر بہنوں کو جائیداد میں سے حصہ دیا گیا تھا۔

۳۔ جعفر بھائی نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو این سی سی میں بھی حصہ لیا۔ این سی سی میں فوجی بوٹ اور یونیفارم بھی ملا کرتے تھے۔ غالباً انہی فوجی بوٹوں کا ذکر ابا جان نے مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔

۴۔ ٹائلہ اور کالو پڑوسیوں کے بچے تھے۔ یہاں ایک بڑا کنبہ بستا تھا۔ کبھی سب آپس میں گتھم گتھا اور کبھی قہقہوں کی گونج۔ جب ہم لاہور شفٹ ہوئے تو امی جان کی مرغیاں بکریں اور دیگر پالتو جانور بھی ساتھ تھے۔ مرغیاں گلی میں نکلیں تو ان پڑوسیوں نے منکا ڈال کر ہڑپ کر لیں۔ ابا جان نے پوچھ گچھ کی تو وہ اکڑنے لگے۔ ابا جان نے غصے میں پستول نکال کر دھمکایا تو چاپائی ہو گیا۔ شام کو باقاعدہ وفد آیا اور یقین دہانی کرائی گئی کہ آئندہ شکایت کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ محلے کو بھی خبر ہو گئی کہ "شاہ جی دادا ہے"۔

(۴۴) لاہور

۲۷ مارچ ۸۴ء

بیگم! اسلام مسنون

تمہارا خط ملا۔ تم لوگوں کی خیر و عافیت سے آگاہی ہوئی۔ آج بخاری لیلیٰ کا چوتھا پرچہ ہے۔ اُس کی حالت عجیب ہے۔ پرچہ دینے سے پہلے پریشان ہو جاتی ہے کہ کیا خبر کیسے مشکل سوال آئیں گے لیکن پرچہ حل کرنے کے بعد ہال سے باہر نکلتی ہے تو بڑی خوش ہوتی ہے کہ پرچہ اچھا ہو گیا ہے۔ میں اُسے پڑھانے سے زیادہ اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہتا ہوں کہ خدا کرے اُس کی محنت ثمر آور ہو۔ دن رات کتابوں میں سر دیئے بیٹھی رہتی ہے۔ شعبان خان کی بیوی اس کے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہے اُسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی اور اپنی بچیوں کو بھی اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔ تم نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ آخر تمہارے میکے والے ہی ہمارے کام آئے البتہ اس میں کچھ نہ کچھ لالہ رُخ کے دودھیال کا کرشمہ بھی ہے۔ قمر النساء کو جب معلوم ہوا کہ میرا تعلق چشتیہ فرقہ کے صوفیوں سے ہے تو بڑی متاثر ہوئی اور کہا کہ ہمیں جب کبھی فیض پہنچا ہے چشتیوں ہی سے پہنچا ہے اس لیے آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔

بڑی خوش عقیدہ ہے۔ حافظِ قرآن بھی ہے اور پابندِ صوم وصلوٰۃ بھی۔ نیک لوگ ہیں۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ خدا کی رحمت ہم جیسے گناہ گاروں کے لیے وقف ہے اور نیک لوگ گناہ گاروں کے کام سنوارا ہی کرتے ہیں۔ ساجد حسین اپنے جانے کی تاریخ لکھ بھیجے تو جعفر رضا کو گل کے پاس راولپنڈی بھیج دینا۔ وہاں کا قیام صبر آزما ہو گا لیکن جہاں اپنائیت اور مجبوری ہو وہاں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ گل کا اکیلا رہنا میرے لیے تشویش کا باعث ہو گا۔ اختر شاہ کو خط لکھ دینا کہ میں راولپنڈی میں ہوں تا کہ وہ تمہارے ساتھ رابطہ قائم کر سکے۔ کرایا امی جان سے لے لینا میں اُنہیں ادا کر دوں گا۔

فرحت رلیجہ کو دعا۔ امید ہے کہ وہ پڑھنے میں جُتی رہتی ہوگی کہ دوسری کمپارٹ میں تو اُسے پاس ہوناہی چاہیے۔ اُمید ہے کہ سرور اور نسیم کی بچیاں کامیاب ہوگئی ہوں گی اور فرحت کے گھر میں ہر طرح سے خیریت ہوگی۔

یہاں دو دن خوب گرمی رہی۔ کل سے پھر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور موسم خوشگوار ہوگیا ہے۔

فقیر
علی عباس

ابا جان میرے مختلف نام لیا کرتے تھے کبھی رُشی کبھی لالہ رخ کبھی مس بخاری کبھی بی بی جان اور کبھی بخاری۔ میرے ایم اے اردو کے پیپر تھے۔ ابا جان مجھے ساتھ لے کر لاہور پروفیسر ظفر علی خاں (دیال سنگھ کالج لاہور) کے گھر دھرم پورہ مقیم ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی ایڈووکیٹ شعبان خان اور بیگم قمر النساء نے بہت تعاون کیا۔

فرحت رلیجہ میری ہم عمر تھی۔ ابا جان کے پیر بھائی رلیجہ لال خاں کی بیٹی۔ ایف اے کی انگلش پڑھنے کے سلسلے میں ہمارے گھر جلال پور میں قیام پذیر تھی۔ اس کی بڑی بہنیں سرور رلیجہ اور نسیم رلیجہ کا بھی آنا جانا تھا۔ ان سب سے اپنائیت اور خلوص کا رشتہ ہنوز باقی ہے۔

لاہور
۵ اپریل ۱۹۸۴ء

بیگم اسلام مسنون

تمہارا خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ لالہ رُخ کا آخری پرچہ پرسوں یعنی ۷ اپریل کو ہوگا۔ پہلے پرچے بھی اچھے ہو گئے ہیں۔ انشاءاللہ یہ بھی اچھا ہی ہوگا۔ ہم انشاءاللہ دوسرے دن ۸ اپریل کو جہلم کے لیے روانہ ہوں گے۔ وہاں سے راولپنڈی جانے کا ارادہ ہے۔ گل کے ہاں دو چار دن رہ کر جلال پور آنے کا خیال ہے۔ حامد سلمہ یہاں بھی آیا تھا۔ اُس نے بتلایا تھا کہ جعفر سلمہ کی تعیناتی بفضلہ جلدی ہو جائے گی اور اُسے تقرری کے احکام مل جائیں گے۔ وہ جہال پور گیا تھا تو اُسے اختر حسین سلمہ نے اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی۔ شاید جہلم ہی میں تعیناتی ہو جائے۔ اختر حسین سلمہ کے ساتھ افسر متعلقہ نے وعدہ کیا تھا۔ اُمید ہے کہ بفضلہٖ جعفر کا کام ہو جائے گا۔

تمہارا اسلام مسز شعبان خاں تک پہنچا دیا ہے۔ اُس نے بھی تمہیں سلام بھجوایا ہے۔ حمیدہ کی مزاج پُرسی کرنا اور اسے کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دُکھ کے بعد سکھ کے دن آتے ہی ہیں۔

امید ہے کہ چک جانی والے بھی خیریت سے ہوں گے۔
لالہ رُخ کی طرف سے سلام اور حمیدہ کی مزاج پُرسی۔

دعا گو
علی عباس

حمیدہ پڑوسن تھی۔ بیماری اور غربت کے ہاتھوں سخت پریشان رہتی۔ والد گرامی اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ حوصلہ بھی بڑھایا کرتے تھے۔

چک جانی والے۔ فرحت، رابعہ اور اس کا خاندان تھا۔

درج ذیل خطوط جو مجھے محفوظ حالت میں ملے ہیں وہ ہمارے بڑے اور محترم بھائی جان سید حامد رضا کے نام ہیں۔ بھائی جان بہت چھوٹی عمر میں ابا جان کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ ان کا ہاتھ پکڑ کے ابا جان نے لکھنا سکھایا۔ تختی دھو کر اور پنسل سے اب پ لکھ کر دیتے۔ حامد بھائی ننھے منے ہاتھوں سے قلم دوات لیے انہماک سے ان حروف پر قلم پھیرا کرتے۔ ہمارے ابا جان نہایت شفیق باپ تھے۔ اپنے میسر وسائل سے اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں خوشی محسوس کیا کرتے۔ حامد بھائی جان نے بی۔ اے آنرز کے بعد ایم اے تاریخ کیا اور بحیثیت لیکچرار پنڈ دادن خان کالج میں تعیناتی ہو گئی۔ ابا جان کا خیال تھا کہ وہ سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری کریں مگر گاؤں کے ماحول میں غالباً یہ ممکن نہ ہو سکا۔ حامد بھائی جان نے اپنے والد کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی بقول جعفر بھائی جان کے ہمارا بھائی تو عظمت کا مینارہ ہے۔ ۲۰۱۰ء کے اختتام تک وہ بطور پرنسپل ریٹائر ہونے والے ہیں اور ابا جان کی کتب کا ورثہ دیکھ رہے ہیں۔

گوجرانوالہ

۸۔ جولائی

حامد میاں! دعوات

خط ملا۔ میرا خیال تو یہی تھا کہ تم لوگ یہاں چلے آتے کہ ابھی جلال پور میں گرمی بہت ہوگی اور پانی کی تکلیف بھی ہوگی۔ بہر صورت اگر تمہارا پروگرام جلال پور جانے کا ہی بن جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہاں جانا بھی ضروری تھا۔

تمہارے دو کرتے ململ کے اور دو پاجامے لٹھے کے درزی کو دے رکھے ہیں۔ اتوار آئندہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تمہارا مستقل پتہ آنے پر یہاں سے پارسل کرا دوں گا۔ یہاں گرمی پھر شدت اختیار کر گئی ہے۔ جس کے باعث میری طبیعت بھی مضمحل رہتی ہے۔ امید ہے کہ بارش کے بعد سنبھل جائے گی۔

جمیل[1] کی شادی میں کیا رکاوٹ ہو گئی۔ دراصل اس کی شادی کے ستارے شروع سے گردش میں ہیں۔ کسی پیر صاحب کو شیرینی دے گا تو بات بنے گی۔

اپنے ماموں جان، خالہ جان اور امی جان کو سلام مسنون کہنا۔ بچوں کو پیار اور دعوات، ضروری احوال سے مطلع کرتے رہنا۔

دعا گو

ابا جان

حامد بھائی جان اُن دنوں امی جان کے ہمراہ جیلاں میں مقیم تھے۔

[1] جمیل جیلاں میں ماموں جان اکمل کے بھائی چاروں میں سے تھے۔ جمیل اور ان کی ہمشیرہ وشیدہ بی بی کافی عرصہ گوجرانوالہ امی جان اور ابا جان کے خدمت گار رہے۔ ان کی والدہ حشمت بی بی ہم سے بہت محبت کرتی تھیں۔

گوجرانوالہ

۱۳ جولائی ۶۶ء

عزیز القدر! دعوات

خط ملا۔ تم نے والد صاحب کا جو القاب لکھا ہے یہ کچھ بھاری بھرکم سا ہے۔ ''ابا جان'' میں زیادہ یگانگت پائی جاتی ہے اور یہی اولیٰ ہے۔

جعفر کو تم لوگوں نے جلا وطن کر دیا ہے۔ کل وہ اچانک آن وارد ہوا تو میں ہکا بکا رہ گیا کہ کیا افتاد پڑی۔ اسی وقت راجہ افضل خاں (چک جانی) بھی آ گئے۔ اُن کی زبانی احوال معلوم ہوا۔ بہر صورت اس کے آ جانے سے ایک فائدہ ہو گیا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر سے آٹھ انڈے ڈھونڈ نکالے ہیں جن پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی اور مرغیوں پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر دی ہے۔ میرے لیے تو وہ دردِ سر بن گئی تھیں۔ میں بار ہنکاتا ہوں تو پھر آ گھستی ہیں اور چیخ پکار سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کل سے مرغی خانہ جعفر کے حوالہ کر دیا ہے۔

جعفر کی زبانی یہ معلوم کر کے ناخوشگوار حیرت ہوئی کہ ابھی تک امروز آپ کے نام جاری نہیں ہوا۔ پرچہ آیا ہو تو اطلاع دینا کہ امروز والوں کو یاد دہانی کرا دوں۔ راجہ افضل جا چکے تھے کہ جعفر نے تیل اور رُخی کی کتابوں سے متعلق کہا اور کوئی شخص آیا تو بھجوا دوں گا۔ میرے پرچے ابھی تک نہیں پہنچے۔ میں تو بہر صورت اُن سے فارغ ہو کر ہی آ سکوں گا۔ ۳، ۴ سو روپے کا چکر ہے اور ہاں یاد آیا۔ میاں خدا بخش جھمو رچو کیدار کو چھ روپے اور مستری خدا بخش کو ۵ روپے دے دینا۔ میں نے ایک آدمی سے ۶۰ روپے لینے ہیں۔ قاضی غلام نبی صاحب کو خط لکھا ہے کہ اس سے لے کر آپ لوگوں کو دے دیں۔ کل رُخی کو پیار۔ اپنی امی جان کو سلام علیکم کہنا۔

دعا گو

علی عباس

راجہ افضل میری دوست فرحت راجہ کے خالو جان تھے۔ جعفر شاہ کو وہی گوجرانوالہ ساتھ لائے تھے۔

قاضی غلام نبی صاحب ابا جان کے خیر خواہوں میں شامل تھے انھوں نے جلالپور شریف کی تاریخ لکھنے میں ابا جان سے کافی رہنمائی بھی حاصل کی تھی۔

۲۳۔ جولائی ۶۶ء

حامد میاں! خط تمہارا ملا۔ ممانی بھجاں کی علالت کی خبر باعثِ تشویش ہوئی۔ اب دورہ گزر گیا ہے۔ احتیاط کی ضرورت ہے۔ دال ماش، بھنڈی، دال چنا، آلو سے پرہیز ضروری ہے۔ گوشت کا شوربا یا یخنی دیں۔ چند دنوں تک طاقت آ جائے گی۔

جعفر میاں بظاہر خوش ہے۔ صبح اور دوپہر کو پڑھتا ہے۔ سہ پہر کو نہانے اور کھیلنے چلا جاتا ہے۔ جو اشیا تم نے لکھی ہیں وہ کوئی قابلِ اعتماد آدمی مل گیا تو بھیج دوں گا۔

گرمی یہاں بھی بہت ہے۔ ایک آدھ بارش زور کی ہوئی۔ اب تو سخت حبس ہے۔ رات کو مچھر ستاتا ہے۔ تمہارا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ یکم اگست تک مشتہر ہو جائے گا۔ خدا بہتری کرے۔ نتیجہ نکلنے کے دس دن بعد کالج کا داخلہ شروع ہو جائے گا۔ جس کے لیے تمہیں یہاں آنا پڑے گا۔ فوٹو وغیرہ درخواست کے ساتھ لگانی ہیں۔ پھر اکٹھے جلال پور جائیں گے۔

یہ اچھا ہوا کہ اخبار لگ گیا ہے۔ بین الاقوامی حالات خاصے خدشناک ہو گئے ہیں۔ امریکی جرائم پیشہ امن عالم کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

ماسٹر خدا بخش[1] کو میں نے شیعہ نہیں کیا۔ میں نے تو محض انہیں مرشدِ کامل[2] کا پتہ بتایا تھا۔ میں خود شیعہ سنی کے چکر سے بالاتر ہوں۔ بہر حال جو انہوں نے کیا ہے اُن کے اپنے عقیدے کے مطابق درست ہے۔ سنی شیعہ کی تفریق غیر ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ بحیثیت انسان ہونے کے کوئی کیسا ہے۔

جعفر کے نئے کپڑے سلوانے کے لیے دے رکھے ہیں۔ ٹیلر ماسٹر صاحب کو وظائف سے فرصت ہوئی تو شاید ہفتے بھر تک مل جائیں اور ہاں تصیح کی بجائے اس لفظ کی املا تصحیح ہے۔ اپنی امی جان اور ممانی کو سلام کہنا۔ جعفر کی طرف سے سب کو دعوات۔ گل شگفتہ اور لالہ رُخ کو دعائیں۔

علی عباس

---

[1] ماسٹر خدا بخش دراصل ابا جان کی بہی خواہ تھے اور انہوں نے ہی ابا جان کو بی۔ ایڈ کر کے ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا کیوں کہ نواب صاحب ملازمت کا وعدہ تو کرتے مگر نبھاتے نہ تھے۔ انہوں نے وعدہ فردا سے ابا جان کا قیمتی وقت ضائع کیا اور یوں خاندان میں ایک لائق نوجوان کو سزا دیتے رہے۔

[2] مرشدِ کامل ابا جان کے خیال میں مولا علی تھے۔ ان کے مقالے "مرزا غالب کا کلام منقبت" میں ولائے علی کی خوشبو مشکبار ہے۔

۱۲۔اگست

عزیزم ! دعوات

میرا تار مل گیا ہو گا۔عزیز نے ۶۱۲ نمبر لے کر فرسٹ ڈویژن لی ہے۔سب کو مبارک باد۔عزیز کا داخلہ تو عزیز کی غیر حاضری میں بھی ہو جائے گا۔اگر مرمت کا کام زیادہ ہے تو بے شک نہ آنا۔ویسے چند دنوں کے لیے آ جاؤ تو تمہاری Outing ہو جائے گی اور داخلہ بھی ہو جائے گا۔میں نے ڈھیری کے ملیاروں[1] کو وڈے بنے[2] والی زمین جوتنے کے لیے کہہ دیا تھا۔وہ یہاں آ کر اجازت لے گئے تھے۔کنویں والی اراضی خان بلھا کو کہنا کہ جوت لے لیکن اب کے احتیاط رکھے۔گڑ بڑ نہ کرے۔جہاں تک مینڈ[3] کا سوال ہے وہ میں خود آ کر نمٹا لوں گا۔

سب کو سلام دعا۔گل شگفتہ کی علالت کا فکر ہے۔اطلاع دینا۔جعفر ٹھیک ٹھاک ہے۔

دعا گو

علی عباس

۱۔ ارائیں برادری کے کسان۔

۲۔ (جاٹ) بٹنے دوسروں کی زمین جوت لیتے اور فصل آدھی آدھی بانٹ لیتے۔

۳۔ مینڈ: کھیت کی حد۔

گوجرانوالہ

۲۳ ستمبر

عزیزم! دعوات

آپ لوگوں نے سن لیا ہوگا کہ جنگ عارضی طور پر رُک گئی ہے۔ فوجیں اپنے اپنے مورچوں پر موجود رہیں گی۔ اس عرصے میں عالمی سلامتی کونسل کشمیر کا مسئلہ سلجھانے کی کوشش کرے گی۔ اگر یہ مسئلہ ہندوستان کی روائتی ہٹ دھرمی اور نامعقولیت کے باعث حل نہ ہو سکا تو پھر جنگ کے چھڑ جانے کا امکان ہے۔ فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں اور حالت جوں کی توں ہے۔ کالج اور سکول ابھی بند رہیں گے۔ ہمارا کالج اور ہوسٹل تو ہسپتال بنا دیے گئے ہیں۔ عزیز کا سکول بھی فوج کی تحویل میں ہے۔ جب حالات اعتدال پر آئے تو سکول کھلے گا۔ چند دنوں تک معلوم ہو جائے گا کہ صورتِ حالات کیا ہے اور میں عزیز کو اطلاع دوں گا۔ اتنے عرصے تک وہیں مقیم رہنا ہے اور تھوڑا بہت مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ امید ہے کہ تم پنوال گئے ہو گئے اور میرا پہلا خط مل گیا ہوگا۔

امی جان کو سلام علیکم کہنا اور بتانا کہ تمہاری خالہ جان نے دو کھیس بھیجے ہیں۔ ان کا قصہ کیا ہے۔ انہوں نے چار سیر گھی بھی بھیجا ہے۔ وہ تو خیر میں نے ہی ان سے کہا تھا۔

گل شگفتہ، جعفر رضا اور لالہ رخ سب کو دعوات۔ امید ہے کہ تم لوگ صلح اور آشتی سے رہتے ہو گے۔ مولوی ¹ڑات کو آتا ہوگا۔

دعا گو

علی عباس

1۔ مولوی خدا بخش جمیر چوکیدار

گوجرانوالہ
۲۴۔اگست ۶۷ء

عزیز القدر! دعوات

آج میرے تبادلے کے احکام پہنچ گئے ہیں۔ میرا تبادلہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور ہوا ہے بحمد اللہ۔ میں نے خود یہ تبادلہ کروایا ہے۔ یکم ستمبر کو میں یہاں چارج دے دوں گا اور ۸ ستمبر کو لاہور جا کر چارج لے لوں گا۔ مکان کے لیے شفقت تنویر مرزا اور حق نواز کو خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس وقت تک انتظام ہو جائے گا۔ انشااللہ۔ تم لوگ یکم سے پہلے پہنچ جاؤ۔ سامان وغیرہ پیک کرنا ہے۔ کتابیں تو میں نے پیک کر دی ہیں۔

جعفر سلمہ کا بخار اتر گیا ہے اور وہ صحت مند ہے۔ رُخی اور گل بھی ٹھیک ہیں۔ ٹیپ ضروری ہو تو ایک دو دن لکھوا کر کرا دیں۔ عزیز کا migration کا معاملہ بھی طے کرنا ہے۔

قاضی صاحب ملیں تو سلام علیکم کہیں۔

دعا گو
علی عباس

حق نواز بھائی ہماری بڑی خالہ "بوبو جی" کے بیٹے تھے جو ان دنوں سلسلہ ملازمت لاہور میں مقیم تھے۔

لاہور
۳۰۔اگست ۱۹۶۹ء

عزیز القدر! دعوات

خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ میرے خیال میں اس سال سیڑھیوں کے اوپر دروازہ لگانا اشد ضروری ہے تا کہ کوئی لڑکا اوپر سے نیچے نہ آ سکے۔ باقی چیزیں بعد میں بن جائیں گی۔ دو سال کے بعد جب گھر جائیں گے تو ایک ہی دفعہ سب کچھ درست کرا دیں گے۔ بشرط زندگی۔
اس طرح پیوند کاری سے کچھ نہیں بنے گا۔ دروازے کے لیے مستری غلام رسول کو بلا کر کہیں۔ بڑے شہتیر کو نہ چھیڑے باقی جو لکڑیاں پڑی ہیں ان سے دروازہ بنائے اور پتھر جو مغربی صحن میں پڑے ہیں کوٹ پیٹ کر کام میں لائے۔ اُسے اجرت تم لوگ ادا نہ کرنا وہ مجھے حساب بتا کر وصول کرے گا۔ مزدوروں اور مٹی وغیرہ کی اجرت اور قیمت البتہ ادا کر دیں۔ لال دین کو کہنا وہ غلام رسول کو بلا لائے گا۔
لال دین ہی سے نمبردار سے اس سال کا مالیہ بھی معلوم کرا لینا اور مجھے بتانا میں بھیج دوں گا۔ یکم ستمبر کو ایک صد روپیہ منی آرڈر کر دوں گا۔ میاں خدا بخش دن کو مکان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تو اس دفعہ چابیاں کریم[1] نبی کو دے آنا۔ اُسے کچھ دیتے رہیں گے اور وہ دن رات نگرانی بھی کر سکے گا۔ تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔ یکم ستمبر کو جعفر کا سکول کھل جائے گا۔ مجھے بھی پرچوں کی پڑتال کے لیے کالج آنا پڑتا ہے۔ گل گھر میں اکیلی رہ جائے گی۔ عزیز آ جائے تو انسب ہے۔ اپنی امی جان کو سلام علیکم کہنا۔ گل اور جعفر آداب عرض کرتے ہیں۔ لالہ رخ کو دعوات۔

دعا گو
علی عباس

پس نوشت: میاں خدا بخش سے سن[2] لے لینا۔ چار پائیوں کی بنائی کے کام آئے گی۔ لال سے کہنا میاں خدا بخش سے حساب کرے اور جو روپے میرے ذمے ہوں وہ مجھے بتا دے۔ ادا کر دیں گے۔

۱۔ کریم: پڑوس میں رہنے والا کمہار تابع فرمان انسان تھا۔ ۲۔ سن: پٹ سن کی رسی

سید علی عباس جلالپوری
ڈاکخانہ۔ جلال پور شریف، ضلع جہلم
تاریخ ۴، مارچ

عزیز القدر! دعائے سلامتی

عزیزہ[1] کی date sheet پہنچ گئی ہے۔ محمد خاں کلیم ایڈیٹر ''محفل'' شیخ بلڈنگ رائل پارک میکلوڈ روڈ نے عزیزہ کی ڈگری کنٹرولر صاحب کو دکھا کر واپس بھیج دی ہے اور لکھا ہے کہ رول نمبر امتحان سے سات یوم قبل بھیجا جائے گا۔ عزیزہ کا پہلا پرچہ ۱۷ مارچ کو ہے آخری ۷ اپریل کو ہوگا۔ پرچوں میں کم و بیش دو دو دن کا وقفہ ہے اس لیے جہلم کو قیام گاہ بنانا مشکل ہو جائے گا۔ میں انشاء اللہ ۱۴ یا ۱۵ مارچ کو جہلم پہنچ جاؤں گا اور ۱۶ کو عازم لاہور ہوں گا۔

تمہاری امی دعا کہتی ہے۔ لالہ رُخ کی طرف سے آداب

فقیر
علی عباس

پ۔ن: اب محمد خاں کلیم صاحب کو ملنا ضروری نہیں رہا۔ بہر حال عزیز کا اُدھر سے گزر ہو تو ملتا جائے۔ اچھے آدمی ہیں۔ عزیز جعفر یہاں آ جائے تو انسب ہے۔

---

[1] میرے ایم اے اردو کے امتحانات کے لیے ابا جان مجھے لاہور لے گئے تھے۔ میرے پیپرز کے دوران اُن کے کزن امجد صاحب ایگزیکٹیو انجینئر واپڈا (ر) انہیں ساتھ لے جاتے۔ ابا جان نے اپنا میڈیکل بھی کروایا۔ وزن قدرے بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سب اچھا کی رپورٹ دی۔ یہ لاہور کا آخری سفر ثابت ہوا کیونکہ امتحانات سے فراغت پا کر ہم لوگ باجی گل کے پاس راولپنڈی گئے اور پھر عازم جلال پور شریف ہوئے۔ ۱۴ جون ۱۹۸۲ کی تاریک صبح ابا جان پر فالج نے حملہ کر دیا اور چودہ برس اسی موذی مرض سے نبرد آزما رہے۔

4-A Shabbir Road

Lahore cantt

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

عزیز القدر! دعائے سلامتی

اُمید ہے کہ تم لوگ ہر طرح خیر و عافیت سے ہو گے۔ مجھے یہاں ہر طرح آسائش میسر ہے۔ کل ڈاکٹر سے ملنے کا وقت لیا ہے۔ اُس کے مشورے کے بعد اور Tests[1] ہونے پر دوائی شروع ہو گی۔ مجھے یہاں اگلے جمعہ تک ٹھہرنا پڑے گا۔ اس دوران میں اُمید ہے کہ عزیز جعفر آ جائے گا۔ اگر ضرورت پڑے تو امی جان سے کہیں سجادے کو کچھ راتیں اپنے ہاں ٹھہر جانے کے لیے کہے۔ میرے یہ دن ڈاکٹر کے تعاقب میں گزرے ہیں اُسے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کل اُس سے مل کر پھر منیر[2] صاحب کے ہاں جاؤں گا۔

یہاں ابر گھر کر آ گیا ہے اور خنکی محسوس ہونے لگی ہے۔ بارش ہونے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ امجد حسین گھبوے[3] اچھے میزبان ہیں۔ ہر وقت تواضع اور دلدہی میں لگے رہتے ہیں۔ مس بخاری کو دعا۔ اپنی امی کو میرا سلام کہنا۔

دعا گو

علی عباس

۱۔ ابا جان کو گردے کا درد وقفے وقفے سے ہونے لگا تھا۔ پہلے تو ریح سمجھتے رہے مگر لاہور جا کر معلوم ہوا کہ گردے میں پتھری ہے لیکن آپریشن کی نوبت نہیں آئی۔ urodonal کے متواتر استعمال سے یہ پتھری ٹوٹ کر خارج ہو گئی۔

۲۔ منیر بھٹی صاحب لاہور میں ہمارے مالک مکان تھے۔ ہم جتنا عرصہ بھی لاہور میں رہے ان کے گھر (سعید منزل) میں کرایہ دار رہے۔ منیر بھٹی صاحب کی بیگم چار ننھے منے بچے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ منیر صاحب نے دوسری شادی نہ کی اور اپنے بچوں کی خود پرورش کی۔ ان کی چھوٹی بیٹی نجمہ سے میرے خصوصی مراسم ہیں۔

۳۔ امجد صاحب ابا جان کے کزن بھی تھے اور ان کے مداحوں میں شامل بھی تھے۔ اتفاقاً ان دنوں جلال پور شریف آئے تو ابا جان علیل تھے وہ ابا جان کو ساتھ لاہور لے گئے اور نہایت عمدہ سلوک روا رکھا۔ دونوں میں خاندانی روابط کے علاوہ علمی تعلق بھی تھا۔

سید علی عباس جلالپوری

ڈاکخانہ، جلالپور شریف، ضلع جہلم

تاریخ ۲۳۔ اپریل

عزیز القدر! دعائے سلامتی

اُمید ہے کہ عزیز جعفر نے ڈنگہ کا چکر لگایا ہوگا۔ اُس کے جانے کے دو روز بعد ایک بوڑھا آدمی ڈنگہ سے آیا۔ ایک ہی کائیاں تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ میں آپ کو ۲ ہزار مرلہ دوں گا۔ آصف خاں نے ۲۵۰۰ مرلہ کہا تھا جس پر میں نے اُسے کہا تھا کہ ایک کنال اراضی ڈیرے کے قریب سے بیچ دے دیں گے۔ معلوم ہوا کہ اسی بڈھے نے آصف خاں سے ۲۵۰۰ فی مرلہ کی بات کی تھی۔ مجھ سے بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے ۲ ہزار مرلہ بتایا۔ میں نے اُسے کہا کہ ۲۵۰۰ مرلہ سے کم میں بیچ نہیں دوں گا۔ جعفر کی جو بات آصف خاں سے اس معاملے کے بارے میں ہوئی اُس سے مجھے مطلع کر دینا۔ میں نے اس بڈھے سے کہا کہ ۲۵۰۰ مرلہ جون جولائی تک دیں گے۔ نئے بجٹ اور رمضان شریف کے ساتھ نئی مہنگائی کا جو نیا ریلا آ رہا ہے اُس سے اراضی کی قیمت بڑھ جانے کی توقع ہے۔ اسی وقت لے لو تو تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ وہ گومگو کے عالم میں چلا گیا۔ میں نے اُس کا یہ تاثر دور کر دیا ہے کہ ہم اونے پونے اراضی بیچ کر دیں گے۔

میرے بیگ میں کچھ کاغذ تھے۔ ایک رسالہ تھا۔ Roman slave market کی ایک تصویر تھی۔ کپڑے اتھل پتھل کرتے وقت عزیز کے مکان میں رہ گئی۔ عزیز میرے Notes کو محفوظ کرکے بعد میں منگوا لیں گے۔ جعفر اور نینا[1] کو دعا۔ عزیزہ شگفتہ[2] کے بارے میں تشویش ہے۔ تمہاری امی اُس کے پاس چلی گئی ہوں گی۔ لالہ رُخ اور فرحت راجہ آداب کہتی ہیں۔ ظفر خان صاحب کو دعائے سلامتی۔

خیر اندیش

علی عباس

۱۔ نینا: بھابی جان ثمانہ

۲۔ باجی گل کے ہاں اُس وقت ذیشان حیدر کی پیدائش متوقع تھی۔

یہاں حامد بھائی جان کا بھی ایک خط اندراج کرنا چاہوں گی تا کہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ میرے پیارے بھائی کا طرزِ تحریر بھی کس قدر دلچسپ تھا یہ الگ بات ہے انہوں نے سنجیدگی سے تصنیف و تالیف سے شغف نہیں رکھا۔ جب وہ بی۔ اے آنرز میں تھے تو ابا جان نے انہیں ایک افسانہ ترجمہ کرنے کو دیا تھا ''سائنس کا ابا'' یہ ترجمہ فنون میں اشاعت پذیر بھی ہوا تھا۔ ابا جان کی وفات کے بعد اُن کے بارے میں اپنا دل گرفتہ مضمون بھی اخبار میں دیا تھا۔ درج ذیل خط میں انہوں نے اپنے بڑے بیٹے علی رضا کی پیدائش کی اطلاع دی تھی جو ابا جان کے لیے بے حد باعث تقویت تھی۔ علی رضا نام ان ہی کا تجویز کنندہ نام تھا۔ اپنے ہاتھ میں پہنی سونے کی انگوٹھی جس پر A بنا ہوا تھا وہ بھی علی رضا کو دے دی۔ یہ انگوٹھی انہیں نانا جان نے اُن کی شادی کے موقع پر پہنائی تھی۔

سید حامد رضا

بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے

لیکچرار شعبہ تاریخ

گورنمنٹ انٹر کالج جہلم

۵۔۵۔۸۴

پیارے ابا جان! آداب

آپ سب کو یہ پڑھ کر خوشی ہوگی کہ کل سہ پہر ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں آج ہسپتال سے نغمانہ کو گھر لے آیا ہوں۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی تھی۔ ماں بیٹا دونوں خیریت سے ہیں۔ بچے کا رنگ فی الحال بہت گورا ہے۔ ناک چھپنی اور آنکھیں تو بہ مشکل کھلتی ہیں۔ بالکل آپ جیسی ہیں۔ ہونٹ البتہ ماں جیسے ہیں۔

ساجد بھائی کو آج ہی اطلاع دی ہے۔ جمال پور بھی اطلاع دے رہا ہوں۔ بچے کے متعلق ایک بات بہت دل چسپ ہے کہ ۴ اپریل کو ہماری شادی ہوئی۔ یہ چار مئی کو چار بج کر چالیس منٹ پر پیدا ہوا۔ دیکھیں علم الاعداد والے کیا کہتے ہیں۔ کالج سے میں چند دن کے لیے چھٹی پر رہوں گا۔ اس لیے خط درج ذیل پتے پر لکھیں۔

معرفت چودھری محمد عظمت صاحب

نزد ایوا اسکول، کچہری روڈ۔ جہلم

فرحت کی امی نہایت خوش ہیں گویا ان کا اپنا ہی پوتا ہوا ہے۔ ویسے کل بہت نروس تھیں، فرحت کی طرح۔ رُخی اور فرحت کو سلام۔

فقط آپ کا بیٹا

حامد رضا

بچے کی ولادت کے وقت فرحت رلبجہ کی والدہ نے زچہ و بچہ کو سنبھالا تھا کیوں کہ ہماری امی جان باجی گل کے پاس راولپنڈی میں تھیں۔ علی رضا کی پیدائش کے اگلے دن میرے بھانجے ذیشان حیدر کی ولادت ہوئی جو کہ نہایت تندرست و توانا بچہ تھا۔ اس کا وزن ۱۲ پونڈ تھا۔ ذیشان حیدر کا نام بھی ابا جان نے تجویز کیا۔ باجی گل تین بیٹیوں کے بعد ذیشان حیدر کی پیدائش پر بے حد مسرور تھیں۔ اُن کا پہلوٹھی کا بیٹا محض ۱۵ دن کے بعد وفات پا گیا تھا جس کا ہم سب کو بے حد صدمہ تھا۔ ذیشان حیدر اسی وجہ سے سب کے لیے بے انتہا خوشی لایا تھا۔

چند خطوط جعفر بھائی کے نام بھی محفوظ ہیں۔ جو امی جان کے ساتھ کبھی ھیلاں یا جلال پور شریف جایا کرتے تھے۔ یہ پہلا نامہ منی آرڈر کی رسید کے پیچھے درج ہے۔ ابا جان کی لکھائی بے حد باریک تھی۔ دو انچ کی رسید پر بھی تفصیلی نامہ تحریر کر دیا کرتے تھے مثلاً درج ذیل تحریر دیکھیے۔

عزیزم دعوات

خط ملا۔ تمہاری امی جان کی علالتِ طبع کی خبر سے تشویش ہوئی۔ اگر زیادہ تکلیف ہو جائے تو فی الفور چلے آنا کہ مناسب علاج ہو سکے۔ تم بھی ساتویں دن Daraprim کی گولی کھانے کے بعد لیتے رہنا۔ کوٹھڑی میں پانی آنے کا رستہ بند ہو گیا ہے اب اوپر جانے میں کیا خطرہ ہے۔ دوسرے چوبارے میں اٹھنے بیٹھنے کا کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے شہتیروں کے نیچے بالے دلوائے ہوئے ہیں۔ اس لیے انشاءاللہ چھتیں محفوظ رہیں گی۔ کمال[1] آیا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کی بہن ربیعہ کا اپنڈکس کا اپریشن کرایا گیا ہے۔ تمہارے ماموں جان وغیرہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آپریشن کامیاب تھا اور اب وہ روبصحت ہے۔ بنا پتی[2] کی تکلیف اب یہاں نہیں رہی۔ ۵ پونڈ کا ڈبہ مل گیا ہے۔ ہم سب بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے ہیں۔ رخی نے ایک چٹھی لکھی تھی اب تک مل چکی ہوگی۔ حامد، گل، رخی کی طرف سے اُن کی امی جان کو آداب تمہیں سلام دعا۔ خرچ کفایت سے کریں۔

دعا گو

علی عباس

۱۔ کمال اور ربیعہ ماموں جان اکمل کے بچے ہیں۔

۲۔ بنا پتی گھی نایاب ہو گیا تھا۔

لاہور

۱۷ جولائی ۷۳ء

عزیز القدر! دعوات

خط ملا۔ تمہاری تحریر بڑی پسند آئی۔ تم تو چھپے ہوئے ادیب ہو۔ البتہ ایک چوک تم سے ہوگئی۔ بہر حال کو بحر حال لکھ دیا۔ یہ لفظ "بہ ہر حال (ہر حال میں) ہے۔ بحر تو سمندر کو کہتے ہیں ناں۔ ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہیں۔ شب و روز اسی یکسانیت سے گزر رہے ہیں۔ گذشتہ شب سے پہلی رات شدید بارش ہوئی ہے۔ تم لوگوں کے بارے میں تردد رہا۔ جہاں کوٹھڑی میں پانی گرا ہے وہ کسی معمار کو بلا کر دکھانا۔ میاں سے کہنا بلا لائے گا اور اس سے پوچھنا کہ معلوم کرے پانی کہاں سے آتا ہے اور جہاں کہیں سوراخ ہو بند کرادینا ضروری ہے۔

تم نے اخبار میں دیکھ لیا ہوگا کہ تمہارا نتیجہ ۲۱، ۲۲ کی درمیانی شب کو نکل رہا ہے۔ میں نے تمہارا رول نمبر لکھا تھا لیکن اب ڈھونڈا تو کہیں پتہ نہ چلا۔ واپسی ڈاک رول نمبر لکھ بھیجنا۔

حامد، گل، نرگس کا سلام دعا تمہیں اور تمہاری امی کو پہنچے۔ ڈار صاحب[۱] اور پیر صاحب[۲] کی وفات کا احوال معلوم کر کے صدمہ ہوا۔ خدا بخشے۔

دعا گو

ابا جان

۱۔ ماسٹر خدا بخش ڈار: ابا جان کے نہایت مخلص خیر خواہ۔ دل گرفتہ حالات میں وعدہ گرامی کو تسلی دیا کرتے۔ دادا جان کی وفات کے وقت ابا جان بی۔ اے میں زیر تعلیم تھے۔ اسی وقت سے ماسٹر صاحب ابا جان کا حوصلہ بڑھاتے رہتے۔ ابا جان ان کی بہت عزت و قدر کرتے تھے۔

۲۔ پیر صاحب بھی جلالپور شریف میں معزز ہستی تھے۔ بڈنیاں والا میلہ ہر سال بیساکھی کے موقع پر منعقد کرواتے۔ کبڈی اور کشتی کے مقابلے خاص طور پر مشہور تھے۔ بچپن میں یہ میلہ ہم بھی دیکھنے جایا کرتے تھے۔

سعید منزل نسیم پارک

سانداخورد، لاہور

۲۶۔ جولائی

عزیز القدر! دعوات

خط مل کر کاشفِ حالات ہوا۔ حامد کے خط سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تم نے ۶۹۲ نمبر marks لیے ہیں۔ یہ بات ہمارے سب کے لیے دلی مسرت کا باعث ہوئی اور ہم نے لڈو منگا کر کھائے۔ ہم سب کی جانب سے تمہیں مبارک باد۔ امکان غالب ہے کہ تمہارا وظیفہ بھی آ جائے گا بہر صورت بالفعل اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تمہارے دوست نعیم نے ۴۲۰ مارکس لیے ہیں۔ تمہارے بارے میں اُس نے کہا کہ وہ مجھے اپنا رول نمبر دے گیا تھا اس کی دو مضامین میں Compartement آئی ہے۔ بارے حامد نے تمہارے امتحان کے سوالیہ پرچوں کو ڈھونڈا اور تمہارا رول نمبر مل گیا۔ میں نے انگیٹھی کی دیوار پر کئی ٹیلیفون کے نمبر لکھ رکھے تھے اس لیے اشتباہ ہو گیا کہ ان میں تمہارا رول نمبر کون سا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے پتہ کرایا۔ معلوم ہوا کہ داخلہ اگست کے آخری ہفتے میں ہو گا۔ حامد سنٹرل ماڈل سکول گیا تھا۔ وہ لوگ ابھی Certificate بنا رہے ہیں۔ سکول بند ہے۔ چند ایک کلرک کام کر رہے ہیں۔

کوٹھڑی کے پانی کی بابت تم خود عالم ترکھان سے مشورہ کرنا۔ اُس کا گھر اشتیاق کے گھر کے سامنے ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ پانی کدھر سے آتا ہے۔ اس کوٹھڑی کے اوپر جو چوبارہ ہے اس میں رات کو نہ سونا۔ دوسرے چوبارہ میں نشست برخاست رکھنا اور سب سے ضروری ہے کہ ساتویں دن Daraprim کی گولی کھانے کے بعد ضرور کھانا۔ ملیریا سے محفوظ رہو گے۔

تمہارا جلالپور گزٹ دلچسپ ہوتا ہے۔ ہفتہ وار اخبار سے مطلع کرتے رہنا۔ تمہیں اور تمہاری امی جان کو ہم سب کی جانب سے سلام علیکم۔

خیر طلب

علی عباس

سعید منزل

نسیم پارک، ساندا روڈ

لاہور

۲۵ اگست ۱۹۷۲ء

عزیزم! دعوات

یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ عزیز باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہے۔ اب جبکہ ستمبر کا مہینہ بھی جلال پور ہی گزارنا ہے دوسرے مضامین بھی پڑھنا شروع کر دو۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو چھٹی لکھ دی ہے۔ ریاضی اور تاریخ جغرافیہ کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ میں انشاء اللہ ستمبر کے پہلے ہفتے میں جلال پور آؤں گا۔ ۲ ستمبر کو میرا طبی معائنہ ہے۔ شاید دو سال[1] ملازمت کے اور مل جائیں۔ خوب جی لگا کر پڑھنا اور تاش اور پتنگ بازی میں وقت ضائع نہ کرنا۔ تمہارے لیے گھڑی میں لیتا آؤں گا۔

ہم بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہیں۔

دعا گو

ابا جان

۱۔ ابا جان کو ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں دو سال کے لیے پنجابی پڑھانے پر معمور کر دیا گیا تھا۔ ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ طبی معائنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ غذا کی مقدار کم کر دی تھی اور روزانہ مال روڈ تک پیدل walk کرتے تھے۔ کھانے پینے میں کافی پرہیز رکھا کرتے تھے۔

لاہور

۴ ستمبر ۱۹۷۳ء

عزیز جعفر سلمہ! دعائیں

خط مل کر کاشفِ حالات ہوا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ عزیز حامد کی طبیعت روبہ اصلاح ہے۔ تم نے یہ نہیں لکھا ہے کہ بخار مسلسل آ رہا ہے یا کبھی کبھی نارمل بھی ہو جاتا ہے۔ عزیز کی توانائی عود کر آئے تو اُسے یہاں لے آؤ کہیں مرض میں الجھاؤ نہ پیدا ہو جائیں۔ کل سے رُخی کو بھی بخار آ رہا ہے اگرچہ زیادہ نہیں ہے تاہم نارمل نہیں ہوتا۔ اس کا علاج شروع ہے۔ تمہارا داخلہ بھی قریب ہے۔ دس تاریخ کے ایک دو دن بعد اعلان ہو جائے گا کہ کس کس کو داخلہ ملا ہے اور پھر فیس بھی جمع کرانا ہو گی۔ اس لیے اس وقت تک میرا آنا مشکل ہے بلکہ شاید تمہیں بھی یہاں آنا پڑے گا اور interview[1] دینا پڑے گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ تم عزیز حامد کو لے کر یہاں آ جاؤ اُس کا علاج اچھی طرح سے ہو سکے گا اور تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ امی جان وہاں رہنا چاہیں تو رہیں۔ حالات نے اجازت دی تو میں خود انھیں جا کر لے آؤں گا۔ نہیں تو تم میں سے کسی کو بھیج دوں گا۔

عزیز وقار[2] کی ہمدردی پر مجھے خوشی ہوئی اُسے دعوات کہنا۔ گل اور رُخی کی جانب سے سلام دُعا۔ اپنی امی جان کو سلام علیکم کہنا۔

عزیز حامد کو میری طرف سے تھپکی دے کر کہنا۔ Sheerio

علی عباس

۱۔ جعفر بھائی جان کا میٹرک میں وظیفہ لگ گیا تھا اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ بھی ہو گیا تھا۔ ابا جان کو اپنے اور حامد بھائی اور جعفر بھائی کے ''راوین'' ہونے پر خوشی ہوتی تھی۔

۲۔ وقار: محمد شاہ مرحوم کے سب سے بڑے پوتے ہیں۔ محمد شاہ مرحوم دادا جان کی پہلی بیگم بھاگ بی بی کے بیٹے تھے۔

ابا جان اپنی بڑی صاحب زادی گلِ شگفتہ کو بھی خط لکھا کرتے تھے مگر شاید کوئی بھی خط محفوظ نہیں رہا۔ ۳۰ مارچ ۲۰۰۹ء کو باجی گل کی وفات کے بعد جب میں نے ابا جان کے تحریر کردہ خطوط اکٹھے کیے ان میں باجی گل کے نام تحریر شدہ ایک بھی مکتوب نہ ملا۔ ابا جان اپنی بڑی صاحب زادی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ باجی گل ایک حسین خاتون تھیں۔ ابا جان انہیں چھیڑا کرتے "میرے پاؤں تمہارے پاؤں سے زیادہ سفید ہیں تو وہ خوب پاؤں صاف ستھرے کر کے کہتیں،" مقابلہ کر کے دیکھیں میرے پاؤں زیادہ گورے ہیں۔" اُن کا پہلوٹھی کا بیٹا راولپنڈی میں پیدائش کے چند روز بعد وفات پا گیا۔ پہلے تو صبر کیے رہیں مگر جب لاہور آئیں تو ابا جان کو دیکھتے ہی بین کر کر کے رونے لگیں۔ ابا جان انہیں گلے لگا کر روتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ تسلی دے کر بہلا لیا۔ سوچتی ہوں وہ درد بھرے، وہ ہنستے بلتے دن کہاں کھو گئے ــــ یادیں کبھی ہنساتی اور کبھی رلاتی ہیں۔

میں نے اپنے نام آئے مکاتیب سنبھال رکھے تھے۔ اشاعت کا ارادہ تو نہ تھا۔ ان خطوط نے حیات فسوں گر کے بدلتے مناظر میں بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ دیا ہے۔ آنسوؤں میں مسکان کی جھلملاہٹ اور الجھنوں میں سلجھاؤ کی تدابیر عنایت کی ہیں۔ میں آج بھی انھیں پڑھتی ہوں تو ابا جان کی آواز دھیمے دھیمے سماعتوں میں رس گھولتی، آشا کا پیام سناتی، شرمسار لمحوں کو نظر انداز کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

جلال پور شریف
۲۲ جولائی ۱۹۷۶ء

عزیزہ لالہ رُخ سلمہا! دعائیں

تمہارا مراسلہ مل گیا ہے۔ احوال سے آگاہی ہوئی اور تم لوگوں کی خیر و عافیت کی خبر معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ تمہاری امی تو کئی دنوں سے مضطرب تھیں کہ پنڈی جا کر خط نہیں لکھا۔ یہاں کل بڑے زور کا مینہ برسا۔ ساری رات دھواں دھار بارش ہوتی رہی کئی لوگوں کے مکان زمین بوس ہو گئے ہیں۔ بہر صورت ہوا میں خنکی اور خوشگواری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

عزیز اختر[1] کے بچوں سے وہاں خوب چہل پہل ہو گئی ہو گی اور تمہارا وقت بھی اچھا کٹتا ہو گا۔ میرا ارادہ ہے کہ تم لوگ یہاں آ ؤ تو انہیں یہاں آنے کی دعوت بھی دی جائے۔

عزیزہ گل شگفتہ سلمہا کو میری طرف سے تسلی دینا۔ جب تمہاری امی خط لکھتی رہتی ہیں تو مجھے ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ عزیزہ کے دل میں وہم اُٹھتے رہتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے کہ ننھی[2] چلنے لگی ہے بہت خوشی ہوئی تمہارا ارادہ جلال پور آنے کا بن جائے تو باجی اور ننھی کو بھی لیتی آنا یہاں چار دن رونق رہے گی۔

عزیز جعفر سلمہ کا ارادہ کیا ہے۔

عزیز ساجد، شگفتہ، ننھی کو ہم سب کی دعائیں۔ اختر سلمہ کے بچے وہیں ہوں تو انھیں اور عزیز امجد[3] اور اُس کے بچوں کو دعائیں۔ امی اور بھائی جان کی طرف سے سلام، دعا۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

۱۔ سید اختر حسین کے پانچ بچے ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی (میری بھابی) نغمانہ ناہید، پھر شبانہ ناہید پھر دو بیٹے بالترتیب سید نجیب حسین اور سید حبیب حسین سب سے چھوٹی صاحبزادی عذیلہ ارم ہیں۔

۲۔ ننھی سے مراد باجی گل شگفتہ کی بڑی صاحب زادی صدف شیریں ہیں۔

۳۔ امجد حسین اختر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔

Lahore

October 10,1978

Dear, Lala Rukh

Your letter came to us as a pleasant surprise. All of us missed you so much after your departure, but keeping in view your education we kept outwardly calm. Little Sadaf Shireen said that you would return in the evening. It is difficult for her mother to give her bath because she says that her aunt would do it. I learned of your difficulties in the Hostel but you know life is not a bed of roses and we must have courage and grit to adjust ourselves to the changed circumstances. I am trying to get your brother transfered to Jhelum. On his coming to Jhelum we shall shift to that town and you can migrate to the girls college over there. If we dont succeed in this plan we are thinking of renting a home at Gujrat and move over there.

As far as your studies are concerned do whatever is possible. I shall of course help you over come your difficulties in English. Meanwhile do your best under the circumestances.

Hamid Raza came in the last week and left with us a hundred rupees for you. The money is lying with us as a deposit. If the food is too spicy you can eat some grapes and banana at your dinner. It will keep you digestion. o.k.

I gave your chit to Najma[1] and she came to get your adress.

She might write to you in one of these days.

Love from your mother, gul and Jafar. Pay our regards to Sardar[2] Begum and thank her on our behalf for what ever she has done for you.

Yours Affectionalety Father.

۱۔ نجمہ میری دوست اور مالک مکان منیر بخش مرحوم کی بیٹی۔

۲۔ سردار بیگم امی جان کی دوست تھیں۔ گجرات ہوسٹل رام پیاری بلڈنگ میں بطور وارڈن تعینات تھیں۔ ابا جان سے بھی ان کے خاندانی مراسم تھے۔ مل بیٹھنے پر دونوں بزرگوں کی باتیں دہرایا کرتے۔ سردار بیگم نے سال چہارم میں مجھے ہوسٹل کی ہیڈ گرل بنا دیا تھا۔ کانووکیشن پر مجھے ہیڈ گرل کے اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔

لاہور

۲۱۔ اکتوبر

عزیزہ لالہ رخ سلمہا! دعائیں

خط ملا، انشاءاللہ عنقریب عزیزہ کی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اُمید واثق ہے کہ عزیز حامد رضا کا تبادلہ گورنمنٹ کالج جہلم ہو جائے گا۔ ارادہ ہے کہ ہم سب بھی وہیں مکان لے کر رہیں اور عزیزہ کو گرلز کالج جہلم میں migrate کرا لیا جائے۔ یہ صورت نہ بن سکی تو گجرات ہی میں مکان لے لیں گے۔ مجھے عزیزہ کی دقتوں کا پورا احساس ہے اور یہ سب کچھ اسی لیے کیا گیا ہے کہ تمہاری تعلیم جاری رہے۔ پیٹ میں ریح (gas) ہوتی ہے تو کسی کیمسٹ سے corbonative mixture (کاربونیٹو مکسچر) بنوا لیں اور کھانے کے بعد ایک خوراک لیا کریں۔ تمہاری امی انہی دنوں میں گجرات آئیں گی اور تمہارے ناشتے کے لیے کوئی چیز بنا لائیں گی۔ نجمہ تمہیں یاد کرتی ہے اور اُس نے کالا سویٹر بھی بُن کر دیا ہے۔ وہ بھی امی تمہیں دکھانے لائیں گی۔ اس نے تمہارے لیے Ovaltine کا ایک ڈبہ بھی بڑے اصرار سے دیا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں انگریزی کا نصاب ختم کرا دوں گا۔ جو ہو سکتا ہے کیے جاؤ۔ عزیز اختر حسین اور اُس کی بیوی یہاں آئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں نے ایک لفافہ بھیجا ہے جو تمہیں تسنیم ملک[1] نے لکھا تھا۔ امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

صدف کبھی کبھی پوچھتی ہے کہ خالہ کہاں چلی گئی۔ جب کہتے ہیں کہ کالج گئی ہے تو کہتی ہے میں بھی گاڑی میں کالج جاؤں گی اور شام کو واپس آ جاؤں گی۔ عفیفہ ماشاءاللہ سوا مہینے کی ہو گئی ہے اور ہاتھ پاؤں نکالنے لگی ہے۔

تمہاری امی، نجمی اور جعفر کی طرف سے دعوات۔ تمہارا روپیہ رکھا ہے یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اُسے کسی مصرف میں لاتی ہو۔ تمہاری امی جان کی طرف سے مسز چودھری کو سلام علیکم

دعا گو

علی عباس جلالپوری

۱۔ میری ایک دوست، لاہور میں میری ہم جماعت رہیں۔

لاہور

۲۴ نومبر ۱۹۷۸ء

عزیزہ سلمہا! دعائیں

یہاں پہنچ کر عزیزہ کا خط دیکھا۔ میں آج ہی ایک سو روپے منی آرڈر کر رہا ہوں۔ اُمید ہے یہ رقم وقت پر مل جائے گی۔ اُلجھن سے بچنے کے لیے آئندہ تم اپنے روپے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔

عزیز حامد رضا کسی دوست کی شادی کے سلسلے میں یہاں دو دن قیام کر کے واپس چلا گیا ہے۔ اُسے عزیزہ کا خط پڑھوا دیا تھا۔ بس پڑھا ہی دیا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ جلال پور کے "مذاکرات"[1] کی تلخیص بھی اُسے بتا دی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ فروری یعنی عزیز ساجد حسین کی آمد تک ہر صورت انتظار کریں گے۔ اس کے بعد بات کسی فیصلہ کُن مرحلے پر نہ پہنچ سکی تو از سرِ نو اس مسئلے کا جائزہ لیں گے۔

عزیز جعفر رضا میڈیکل ٹیسٹ کے لیے call کا انتظار کر رہا ہے۔

تمہاری امی اور باجی کے مابین حسبِ سابق مباحثے ہوتے رہتے ہیں اگرچہ اُن کا موضوع کچھ بھی نہیں ہوتا یا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔

نجمہ[2] تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ کبھی کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور کبھی ان گھٹاؤں کے کنارے اُمید کی کرنوں سے سنہرے ہو جاتے ہیں عجیب گومگو کے عالم میں ہے۔

عزیزہ کا سویٹر مکمل ہونے پر پارسل کر دیا جائے گا۔

تمہاری امی، باجی اور جعفر کی طرف سے دعائیں۔ صدف شیریں اور عفیفہ زریں[3] خیریت سے ہیں اور خوب چونچال ہیں۔ اپنی دونوں سہیلیوں کو میری طرف سے دعا کہنا جن سے ایک نہایت مختصر لیکن بڑی خوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ مسز چوہدری[4] کو اپنی امی جان کی طرف سے سلام مسنون۔ وہ کسی دن آئیں گی۔

ابا جان

۱۔ حامد بھائی کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ ۲۔ نجمہ اپنے پھوپھی زاد سے بچپن سے منسوب تھی مگر خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے یہ رشتہ ڈانواں ڈول ہو گیا مگر بعد ازاں الجھاؤ ختم ہو گئے اور شادی طے ہو گئی۔ ۳۔ باجی گل کی منجھلی صاحب زادی ۴۔ وارڈن ہوسٹل گجرات۔ مسز سردار چودھری۔

لاہور

۱۷ جنوری ۱۹۷۹ء

عزیزہ سلمہا! دعائیں

عزیزہ کے دونوں خطوط ملے۔ احوال سے آگاہی ہوئی اور عافیت کی خبر سے اطمینان ہوا۔ میں نے کئی دن ہوئے ایک سو روپے کا منی آرڈر بھیجا تھا۔ اُمید ہے کہ اب تک مل گیا ہوگا۔ عزیزہ کسی دن جمالپور جائے اور عزیزہ گل شگفتہ[1] اور بچیوں کی خیریت سے ہمیں باخبر کرے کہ اس ضمن میں مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی ہے۔ مسز چودھری کی چچازاد بہن کی وفات کی خبر سن کر دلی افسوس ہوا۔ عزیزہ میری طرف سے اُن سے اظہار افسوس کرے۔ عزیزہ کی والدہ کسی دن تعزیت کے لیے مسز چودھری کے پاس آئے گی۔ عزیز کا تبادلہ ہو گیا تو عزیزہ کو انشاءاللہ migrate کرالیں گے اور موجودہ آزمائش کا دور ختم ہو جائے گا۔ عزیز جعفر سلمہا کا کام بھی انشاءاللہ ہو جائے گا۔ امی تمہیں دعا کہتی ہیں۔ عزیز جعفر کی طرف سے دعائیں۔

بہی خواہ

علی عباس

۱۔ ساجد بھائی جان بسلسلہ ملازمت ایئر فورس لیبیا چلے گئے تو کچھ عرصہ باجی لاہور رہیں۔ عفیفہ زریں لاہور ہی کے ہسپتال میں پیدا ہوئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد باجی گل سسرال جمالپور جا کر رہیں۔ وہیں سے بھائی ساجد لیبیا لے گئے۔

سید علی عباس جلالپوری
A-11-نسیم پارک ساندا روڈ-لاہور
مورخہ ۲۵-اپریل

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

خط ملا۔ یہ معلوم کر کے اک گونہ مسرت ہوئی کہ عزیزہ نے انگریزی کے پرچے میں امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ مبارک باشد۔ یاد رہے کہ اچھی کارکردگی کے لیے سارے مضامین کو یکساں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عزیزہ ہر روز سب مضامین کو وقت دیا کرے۔ ہاں انگریزی کو بہ نسبت دیگر مضامین کے زیادہ وقت دینا انسب ہے۔

میں آج دو سو روپے منی آرڈر کے ذریعے بھجوا رہا ہوں۔

عزیز حامد سلمہ کا تبادلہ ہونے پر انشاءاللہ عزیزہ کو جہلم کے گرلز کالج میں منتقل کرا لیں گے۔

اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ رات کو کم از کم آٹھ گھنٹے سونا ضروری ہے۔ کم سونے سے ذہن پر بار پڑتا ہے۔

ہمیں ساجد حسین سلمہ کا انتظار ہے۔ صدف شیریں خالہ کو بہت یاد کرتی ہے۔ خاص طور سے رات کو سوتے وقت۔ عفیفہ بھی ماشاءاللہ تندرست ہے۔

ہم سب کی طرف سے دعائیں۔ مسز چودھری کو سلام مسنون

دعا گو

علی عباس

سید علی عباس جلالپوری

A-۱۱۔ نسیم پارک ساندا روڈ، لاہور

مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء

عزیزہ سلما! دعائیں

اُمید ہے کہ تم قرینِ صحت و عافیت ہو گی۔ جواب میں دیر اس لیے ہوئی کہ جمال پور[1] جانے کا پروگرام بن گیا۔ عزیز اختر حسین نے لکھا ہے کہ ۱۹ مئی کو جمال پور پہنچ جائیں۔ عزیزہ گل بھی ۲۳۔ ماہ حال کو باہر[2] جا رہی ہے۔ اس تقریب کے ساتھ اُس کو رخصت بھی کر لیں گے۔ رسمِ منگنی کے لیے ۱۹ مئی کی تاریخ دی گئی ہے۔ میں اور تمہاری والدہ ۱۸ مئی کو گجرات پہنچ جائیں گے اور عزیزہ کو ہمراہ لے جائیں گے۔ عزیز حامد نے کہا تھا کہ وہ بھی ۱۸ مئی کو وہیں پہنچ رہا ہے۔ اگر وہ ہم سے پہلے پہنچ گیا تو عزیزہ کو ساتھ لے جائے گا۔ بہر صورت ۱۸ مئی کو تیار رہیں۔ باقی بوقتِ ملاقات۔

خیر اندیش

ابا جان

۱۔ جمال پور گجرات سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے۔

۲۔ باجی گل کو ساجد بھائی لیبیا لے گئے تھے۔ ان کی چھوٹی صاحب زادی ماہ جبیں لیبیا ہی میں پیدا ہوئیں۔

لاہور

۲۹ مئی ۱۹۷۹ء

عزیزہ لالہ رُخ سلمہا

دعائیں۔ عزیزہ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہو گا کہ عزیزہ کے ماموں محمد افضل خاں ۲۲۔ ماہ حال کو کراچی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں میت کو بذریعہ طیارہ لے کر لاہور پہنچے اور یہاں سے ہیلاں گئے۔ ہمیں وقت پر اطلاع مل گئی تھی اس لیے ہم جنازے اور تدفین کی رسوم میں شریک ہوئے۔ واپسی پر دیر ہو گئی تھی اس لیے عزیزہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اُمید ہے کہ عزیزہ خیر و عافیت سے ہو اور پرچے اچھے ہو رہے ہوں گے۔

تمہاری امی جان دعا کہتی ہیں۔

خیر طلب

علی عباس

پس نوشت: میں نے یہ خط ابھی ڈاک کے سپرد نہیں کیا تھا کہ تمہارا خط ملا ہے اور خیریت کی خبر پا کر اطمینان ہوا۔ قرائن تو یہی ہیں کہ ہم ۱۹۔ جون تک یہیں ہوں گے۔ ساجد کے فرج کا انتظار تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ نجمہ تمھیں سلام کہتی ہے اور جو مرہم اُس کی بھاوج استعمال کرتی رہی ہے اُس کا نام Ultralanum ointment ہے۔ تمہاری والدہ کو قدرتاً اپنے شفیق بھائی کی موت کا بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میں اُس کی تالیفِ قلب کی کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن اس نوع کے صدمات کا مداوا وقت ہی کر سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ تم باقاعدگی سے اپنا مطالعہ کر رہی ہو گی۔ عزیز حامد سلمہ کا تبادلہ اُمید ہے جون کے آواخر میں ہو جائے گا انشاء اللہ عزیزہ کے خط سے معلوم ہوا کہ اُس کے خیالات کے ساتھ اسلوب بیان میں بھی پختگی آ گئی ہے ماشاء اللہ۔

اکمل[1] اور اس کی بیوی کا رویہ ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا لیکن ہمیں اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ ہم تو مرحوم کے بیٹے بیٹیوں اور زوجہ کے ساتھ تعزیت کے لیے گئے تھے اور انھی کے پاس ٹھہرے۔ بڑے فطین اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ میں نے پچاس روپے بطور فاتحہ خوانی اُنھیں دیئے تھے۔ اُن سے مل کر اپنائیت کا احساس ہوا۔

۱۔ ماموں جان اور ان کی بیگم اراضی کے تنازعہ کی وجہ سے امی جان اور دیگر افرادِ خاندان سے خفا خفا سے رہتے تھے۔

لاہور

۲۰ جون ۱۹۷۹ء

عزیزہ! سلامت رہو

خط ملا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم ۲۴۔ ماہ حال کو یہاں آ رہی ہو۔ اُمید ہے کہ پرچے اچھے ہو گئے ہوں گے۔

گورنمنٹ کی بس میں بیٹھ کر آؤ تو وہ لیڈی وِلنگڈن ہسپتال کے پاس بھی اُتار دیتے ہیں وہاں سے سواریوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر بھاٹی دروازے اور وہاں سے ساندا کے تانگے مل جاتے ہیں۔ اگر گورنمنٹ بس کے اڈے پر اُترو تو ریلوے سٹیشن کے سامنے کی جانب مغرب تانگوں کا اڈا ہے وہاں سے سواریوں کے ساتھ بھاٹی دروازے اور وہاں سے ساندا کا تانگہ مل جاتا ہے۔ پرائیویٹ بس سے آنا ہو تو بادامی باغ کے اڈے پر بھی بھاٹی دروازے کے تانگے مل جاتے ہیں۔ سواریوں کے ساتھ بیٹھ کر بھاٹی دروازے اور وہاں سے اسی طرح ساندا۔ رحمان میڈیکل سٹور کے آگے اُتر جانا مگر یہ باتیں تو تمہیں معلوم ہی ہوں گی۔ میں اپنی تسلی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ رکشا میں اکیلی نہ آنا۔

باقی بوقتِ ملاقات

دعا گو

ابا جان

لاہور
۱۸۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

عزیزہ سلمہا

دُعائے سلامتی! اُمید ہے کہ عزیزہ پوری یکسوئی اور دلجمعی سے مصروف مطالعہ ہوگی۔ تمہاری امی کو تمہارے خط کا انتظار رہا۔ اُس کا خیال تھا کہ تم ان ایام میں جمال پور گئی ہوگی اور وہاں سے نینا کے لباس اور جوتے کا ناپ لا کر ہمیں بھیج دو گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو تم گئی ہی نہیں یا ناپ بدستور ایک لا ینحل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ نجمہ کہتی ہے کہ ناپ آ جاتا تو وہ اپنی نگرانی میں دو چار سوٹوں پر کام کروا لیتی۔ اچھا بعد میں سہی۔ ہم لوگ سامان سمیٹ رہے ہیں اور نقلِ مکان کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ارادہ ہے کہ ماہِ رواں کے اواخر میں یعنی ۲۹، ۳۰ تاریخ کو عازمِ وطن[1] ہوں گے۔ اگر ان تاریخوں پر ٹرک کا معقول انتظام نہ ہو سکا تو اکتوبر کے پہلے ہفتے میں جائیں گے انشاءاللہ۔ یہاں کل سے گھن گرج سے مینہ پڑ رہا ہے۔ خاصی ٹھنڈک ہے معلوم ہوتا ہے کہیں ژالہ باری ہوئی ہے۔ ہمارا دھیان رہ رہ کر تمہاری طرف جاتا ہے کہ تمہارے پاس سرما کے کپڑے نہیں ہیں ٹھنڈک ستائے گی۔ عزیزان حامد اور جعفر ایک چکر لگا گئے ہیں۔ عزیز حامد کا تبادلہ تا حال نہیں ہوا لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ اپنی سی کوشش کیے جا رہے ہیں۔ امی جان دعا کہتی ہیں۔

خیر طلب
علی عباس

---

[1] لاہور سے جلالپور شریف منتقل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

سید علی عباس جلالپوری

جلال پور شریف (P.O) ضلع جہلم

مورخہ ۲۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

عزیزہ لالہ رُخ سلمہا

دعائے سلامتی! ہم لوگ بفضلہ کل بخیر و عافیت جلال پور شریف پہنچ گئے۔ ٹرک کا انتظام تمہارے بھائی جان نے کیا تھا۔ وہ علی الصباح ٹرک لے کر لاہور پہنچے اور وہاں سے ایک بجے بعد دوپہر عازم وطن ہوئے۔ میں اور تمہاری امی بس پکڑ کر شام کو پہنچ گئے۔ سامان بحفاظت تمام یہاں آ گیا اور کسی چیز کا نقصان نہیں ہوا۔ اس طرح یہ کٹھن مرحلہ بحسن و خوبی طے ہو گیا اور میں ۳۳ برس کی جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنے آبائی گاؤں آیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہاں کا موسم بہت اچھا اور صحت پرور ہے۔ روشنی اور صاف ہوا اور صحت بخش پانی میسر ہے۔ مجھے لاہور سے آنے کا بالکل ملال نہیں ہوا البتہ محمد منیر بھٹی صاحب اور نجمہ نے جس محبت اور خلوص سے ہمیں رُخصت کیا اس سے طبیعت افسردہ ہو گئی اچھے لوگوں سے بچھڑنے کا غم تو ہوتا ہی ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ نجمہ تمھیں بہت یاد کرتی تھی۔ اُس کی شادی آئندہ دسمبر میں ہو رہی ہے۔ ملتان سے عشرت[2] کا خط آیا تھا جس میں اُس نے گلہ کیا تھا کہ لالہ رُخ اُس کے خطوں کا جواب نہیں دیتی۔ میں نے یہ شکوہ تم تک پہنچا دیا ہے۔ عزیزہ ہیڈ گرل تو بن گئی ہے لیکن اندیشہ ہے کہ اس نمبرداری سے اس کا مطالعہ متاثر ہو گا۔ رات کو ۱۰ بجے لازماً سو جایا کرو۔ دیر تک جاگتے رہنے سے بے خوابی کی شکایت ہو جاتی ہے اور نیند لانے کا ایک نفسیاتی نسخہ یہ ہے کہ لیٹ کر جسم کو اچھی طرح relax کرو اور آنکھیں بند کر کے کسی خوشگوار تخیل کو ذہن میں بسا لو۔ پانچ دس منٹ میں نیند آ جائے گی۔ بے خوابی زیادہ ہو تو اس طرح آدھ گھنٹے میں لازماً نیند آ جاتی ہے بشرطیکہ ذہن کو پوری یکسوئی سے relax کیا جائے۔

تمہاری امی جان اور بھائی جان کی طرف سے دعائیں۔

خیر طلب
علی عباس

۱۔ نجمہ کی شادی میں امی جان اور میں نے شرکت کی تھی۔

۲۔ ملتان کی امان شاہ ان کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ عشرت اُن کے نواسے ملک مقبول حسین کھوہ کی بیگم ہیں۔ ان لوگوں سے طویل عرصے تک خط و کتابت رہی امی جان اور حامد بھائی اُن کی شادی میں شرکت کے لیے ملتان بھی گئے تھے۔

جلالپور شریف

۲۱ نومبر ۷۹ء

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

تمھیں یہاں سے گئے بہت دن ہوئے لیکن تم نے اپنی خیریت کی خبر نہیں دی۔ اُمید ہے کہ تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ تمہاری امی جان نے بتلایا تھا کہ بس میں تمہیں قے آتی رہی۔ ناقص غذا کی کمی کو دور کرنے کے لیے B complex with c کے کیپسول منگوا کر استعمال کرنا۔ P fizer کمپنی کے اچھے ہوتے ہیں۔ بیس دن کے بعد دس روز کا وقفہ دے کر پھر استعمال کیا کرو۔ ہم بفضلہٖ خیریت سے ہیں۔ صحن میں چبوترہ بنوا دیا ہے اور بڑے کمرے کے دروازوں کے طاق لگوائے ہیں جس سے اس کی شکل معقول ہوگئی ہے۔ تمہاری امی جان اور بھائی جان کی طرف سے دعا پیار۔

اپنی خیریت سے جلدی مطلع کرنا۔

خیر طلب

ابا جان

جلال پور شریف
۳ دسمبر ۱۹۷۹ء

عزیزہ سلمہا۔ دعائیں

خطوط ملے۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ میں ۲۰۰ روپے منی آرڈر کے ذریعے بھیج رہا ہوں۔ امید کہ ضروریات پوری ہو جائیں گی۔
تاریخ ہسپانیہ کے بارے میں اس مرحلے پر تو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ کچھ ابواب خاص طور سے پڑھ لیں۔ کوئی بھی کتاب اس موضوع پر کام دے جائے گی۔ طارق حملے کے اسباب و نتائج، عبدالرحمٰن الداخل (اوّل)، عبدالرحمٰن الناصر، الحکم، ہشام، الحاجب یوسف بن تاشفین، معتمد، مسلمانوں کی تہذیبی سرگرمیاں، طب، فلسفہ، فنِ تعمیر، سائنس، ابنِ رُشد وغیرہ کی کتابوں کے ترجموں کی یورپ میں اشاعت جس سے اہلِ مغرب سائنس اور فلسفہ سے رُوشناس ہوئے وغیرہ اور اُن کی تحریک نشاۃ الثانیہ Renaissance پر عربوں کی تہذیب کے اثرات۔ ان موضوعات کا مطالعہ کرنے سے کام چل جائے گا۔ بعد میں پوری تیاری ہو جائے گی۔ لاہور جانے کی زحمت نہ کریں۔ انشاء اللہ بہتری ہو گی۔ عزیزہ نے ہفتہ عشرہ پہلے بتایا ہوتا تو Notes تیار ہو سکتے تھے۔ اب وقت کم ہے اور میرے پاس بھی متعلقہ کتب نہیں ہیں۔
عشرت اور شیما[1] کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ عشرت اور اس کی امی تم سے بہت شاکی ہیں۔ گل کی خیریت کا خط بھی آ گیا ہے۔ الحمد اللہ۔
ہم بفضلہٖ خیر و عافیت سے ہیں۔ تمہاری امی اور حامد کی طرف سے دعا۔

خیر طلب
ابا جان

---

[1] شیما لاہور کی تھی۔ "فنون" میں ابا جان کے مضامین پڑھا کرتی تھی۔ وہیں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا

جلالپور شریف

۱۱ جنوری ۱۹۸۰ء

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

خط ملے۔ آنکھوں کے بارے میں کسی مستند ماہر امراض چشم سے مشورہ لیں۔ آنکھوں کے آشوب کے لیے گلیکو کے Eye drops ہیں Betnesel-N ہیں۔ ان کے استعمال سے پیشتر ڈاکٹر سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ رات کو مطالعہ ترک کر دیں اور کم از کم آٹھ گھنٹے سویا کریں۔ آنکھوں کو آرام ہوا تو ان ایام کی تلافی ہو جائے گی۔ میں نے عزیزہ کے کہنے کے مطابق عزیز اختر حسین کو خط لکھا تھا۔ اس کے جواب کا انتظار ہے۔

شہناز بی بی کے بارے میں میری سمجھ میں تو یہی بات آئی ہے کہ وہ اپنی پرنسپل صاحبہ سے اپنی افتاد[1] کا ذکر کریں اور اُن کے مشورے اور اجازت سے لوکل ڈگری کالج کے جغرافیہ کے لیکچرر کی دو ماہ کے لیے ٹیوشن رکھ لیں۔ وہ انھیں ہوسٹل کے مہمان خانے میں پڑھا جایا کریں گے۔ اس کے علاوہ تو کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ جغرافیہ بڑا اہم مضمون ہے اور بہت کم خواتین اس میں qualify کرتی ہیں اگر شہناز جغرافیہ میں بی۔ اے یا ایم اے جغرافیہ کر لیں تو ان کا career بہت روشن ہو سکتا ہے۔

میری طرف سے انھیں دعا پیار۔ تمہاری امی اور بھائی جان دعا کہتے ہیں۔

خیر اندیش

ابا جان

---

[1] گجرات ہوسٹل میں شہناز میری دوست تھیں اور انھیں کینسر کا عارضہ لاحق تھا۔

جلال پور شریف

۱۲ مارچ ۱۹۸۰ء

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

عزیزہ اور اس کی سہیلی نائلہ کا رجسٹرڈ خط مجھے بہت دیر سے ملا۔ اس لیے فرمائش ا پوری نہ کرسکا۔ عام ڈاک میں یہ خط آتا تو جلدی مل جاتا۔ عزیز حامد سلمہ کا تبادلہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جہلم ہو گیا ہے۔ عزیز نے گذشتہ جمعرات کو وہاں چارج لے لیا ہے۔ فی الحال وہ ہوسٹل ہی میں مقیم ہے۔ موقع ملا تو کسی کالج میں تبادلہ کرا دیں گے۔ عزیز جعفر پرسوں چلا گیا تھا۔ میں اور تمہاری امی دو ہونے کے باوجود یہاں ۲ "اکیلے" رہ گئے ہیں۔ اتنے بڑے مکان میں دونوں کا "اکیلا" رہنا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن تنہائی انسان کا مقدر ہے۔ رونقیں عارضی ہوتی ہیں۔ تنہائی مستقلاً اس کے ساتھ ہے۔ بقول صوفی تبسم

اس چمن کی دنیا میں ہے کلی کلی تنہا

میری جانب سے نائلہ سے معذرت کر دیں اور شہناز کو دعا کہیں۔ یہاں اُس کا مختصر قیام ایک خوشگوار یاد چھوڑ گیا ہے۔ تمہاری امی کی طرف سے تمہیں اور شہناز کو دعا۔

خیر طلب

ابو جان

۱۔ ادارے میں تقریری مقابلہ جس میں سال دوئم کی طالبہ نائلہ نے تقریر لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے ابا جان کو خط لکھا جو انھیں دیر سے ملا۔

۲۔ جلال پور کے گھر میں ابا جان کی سکونت اوپر والے کمروں میں تھی جبکہ امی جان کا قیام نیچے والے کمروں میں تھا۔ ابا کھانا نیچے آ کر کھاتے اور باقی دن اوپر لکھنے پڑھنے میں معروف رہتے۔

جلال پور شریف

۱۷۔اپریل ۱۹۸۰

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

خط ملا۔میرے خیال میں عزیزہ داخلہ فارم بھجوا کر ہی یہاں آئے تو مناسب ہے۔عزیزہ یہاں آ
اور کالج سے داخلہ فارم روانہ کر دیے جائیں تو شاید عزیزہ کو ان کا پتہ ہی نہ چل سکے۔تعلیم کی کمزوری انشا
اللہ پوری ہو جائے گی۔کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ہر روز دو تین گھنٹے پڑھ لینا کافی ہوتا ہے۔پڑھا
سے فارغ ہو کر خوش گپیاں کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔لیکن مطالعہ کو بہر صورت مقدم سمجھنا ضروری
ہے۔

فرحت چک جانی چلی گئی ہے۔اب غالباً ۱۵ مئی کے بعد ایک آدھ ہفتہ کے لیے یہاں آئے گی
ہم دونوں بفضلہ خیریت سے ہیں۔تمہاری امی عرس کے بعد گجرات جائیں گی۔عزیز حامد سلمہ کا خط آیا
کہ وہ ماتم پرسی[1] کے لیے گجرات جائے گا۔عزیز جعفری کی چٹھی آئی تھی جس سے اُمید ہے کہ مطلوبہ کام ہو
جائے گا۔دعا کرتی رہیں۔تمہاری امی تمہیں پیار کہتی ہیں۔

دعا گو

ابا جان

ا۔ جلال پور سیدان کسی عزیز کی وفات کے موقع پر۔

منی آرڈر کی رسید پر تحریر مختصر نامہ

عزیزہ سلمہا۔ دعائیں

عزیزہ کے دونوں خطوط مل گئے ہیں۔ عزیز حامد سلمہ نے یوم عاشور یہیں گزارا۔ عزیزہ کی تنہائی کا احساس عاشورہ کے دن ہوتا رہا۔ عزیزہ کو بھی اب کے شامِ غریباں کا مفہوم سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ باقی بوقتِ ملاقات۔ ۱۹۔ ماہ حال کو عزیز جعفر سلمہ عزیزہ کو لینے گجرات پہنچ جائے گا۔ انشاء اللہ۔

علی عباس جلالپوری

جلالپور شریف ضلع جہلم
یکم ستمبر ۱۹۸۰ء

عزیزہ سلمہا! دعائے سلامتی

تمہارا خط مل گیا ہے۔ تمہاری خیر و عافیت کی خبر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ یہ امر بھی خوشی کا باعث ہوا کہ تم پورے اعتماد کے ساتھ امتحان دے رہی ہو۔ تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ اب پورے سکون سے امتحان دو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔ انشاءاللہ بہتری ہوگی۔

پہلے پرچہ غور سے پڑھنا۔ پہلی نظر میں پرچہ عموماً مشکل محسوس ہوتا ہے۔ دوسری بار نگاہ ڈالنے سے اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ پھر اس سوال کا جواب لکھنا جو تم بہت اچھی طرح کر سکتی ہو۔ اسی قسم کا ایک سوال آخر میں حل کرنا۔ تمام سوالوں کو مناسب وقت دینا ضروری ہے اور آخر میں ۵، ۶، ۷ منٹ دہرانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ تاریخ کا پرچہ عموماً طوالت طلب ہوتا ہے۔ اس لیے شروع ہی سے لکھنے کی رفتار تیز رکھنا انسب ہے۔ جوابات کے نمبر اور سرخیاں نمایاں ہوں۔ Points پرچہ دیکھنے والوں کو پہلی نظر ہی میں واضح ہو جانے چاہیں۔ خلط ملط نہیں ہونے چاہیں۔ کاپی پر حاشیہ لگانا اچھا لگتا ہے۔ سطریں سیدھی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پرچہ دیکھنے والے یا والی کو دیکھنے میں سہولت ہو اور اُسے Points تلاش نہ کرنا پڑیں۔ پرچے دیکھنے والے کا پہلا تاثر خوشگوار ہو تو وہ کھل کر نمبر دیتا ہے۔ اردو، فارسی کے پرچے میں خوشخطی کا ممکن حد تک خیال رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ خوشخطی کا اہتمام کرتے ہوئے سوال ہی پورے نہ حل ہو سکیں۔ انگریزی کے پرچوں میں Spelling اور Tense کی اغلاط نہیں ہونی چاہییں۔

سب سے آخر میں سب سے ضروری۔ پرچہ مگن ہو کر لکھو۔ نہ کسی کو کچھ بتاؤ نہ کسی سے کچھ پوچھو۔ اس طرح اپنے آپ پر اعتماد مجروح ہو جاتا ہے اور پورے اعتماد سے پرچہ لکھو۔ گھبراہٹ اور بے چینی رکاوٹ بن جاتی ہے اور Good Luck!

جیسا کہ میں نے زبانی کہا تھا۔ رات کو زیادہ دیر تک نہ جاگنا۔ صبح کو جو پرچہ ہو اس پر ایک دوبار سرسری نگاہ ڈال لی۔ یہی کافی ہوتا ہے۔

دعاگو

ابا جان

سیّد علی عباس جلالپوری

4-A Shabbir Road

Lahore cantt

۳ نومبر ۸۰ء

ڈیئر مس بخاری! دعائے سلامتی

خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ عزیزہ فرحت راجہ بھی تمہارے پاس ہے اور تمہارا وقت اچھا گزر رہا ہے۔ میں ڈاکٹر کو ملا ہوں۔ اس نے چند Tests کرانے کے لیے کہا تھا۔ امجد صاحب نے ان Tests میں میرے ساتھ جانا تھا لیکن بی بی جان کی المناک موت کی اطلاع آئی اور سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ اس المیے کی تفصیلات شاید تم نے سن لی ہوں۔ بی بی جان کعبہ کے سامنے نفل پڑھ رہی تھیں کہ قریب ہی سٹوو پھٹنے کا دھماکا ہوا۔ لوگ دہشت زدہ ہو کر بھاگے اور بی بی جان کو جو سجدے میں تھیں کچل کر رکھ دیا۔ وہ وہیں جاں بحق ہو گئیں۔ لوگوں میں بھگدڑ مچنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھے مرتدین نے پھر حملہ کر دیا ہے اور بم مار رہے ہیں۔ شفقات اور جمیل میت لانے کے لیے ہوائی جہاز سے مکہ گئے تو عربوں نے کہا کہ اگر میت کو لے جانا ہے تو اس کا پیٹ چاک کر کے اور صاف کر کے اس میں مصالحے بھرنے پڑیں گے۔ اس پر شفقات نے امجد صاحب کو فون پر مطلع کیا۔ یہاں امجد صاحب اور ان کے بچوں نے کہا کہ میت کا چیر پھاڑ نہ کیا جائے بلکہ اسے وہیں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ کل یہاں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور آج سہ پہر کو قل ہو گئی۔ امجد صاحب کو ناقابلِ بیاں صدمہ پہنچا ہے۔ پہلے دن اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پھر سوگواری کے لیے لوگ آنے لگے اور اُن کی باتوں سے اُن کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ میں نے کہا کہ میں گھر جاتا ہوں Tests پھر بھی ہو جائیں گے لیکن وہ نہیں مانے اور کہتے ہیں کہ اس طرح آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ دو چار دنوں تک Tests ہو جائیں گے پھر ڈاکٹر سے نسخہ لے کر چلے جانا۔ چنانچہ اب مجھے گھر پہنچنے میں چند روز کی تاخیر ہو جائے گی۔ فرحت راجہ چلی جائے تو کسی کو اپنے یہاں رات کو سلا لینا تاکہ مجھے تسلی ہو۔ راجہ محمد افضل خاں اور اُن کا بیٹا بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔ راجہ صاحب نے فرحت کے پاس ہو جانے کا ذکر بڑی خوشی سے کیا۔ لیکن وہ بدستور حواس باختہ ہیں۔ لڑکے کو ملنے ہوسٹل گئے تو اس کے کمرے کا نمبر بھول گئے اور کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے جس کا مقیم لڑکا باہر گیا ہوا تھا۔ راجہ صاحب انتہائی پریشانی میں میرے پاس آئے اور بتایا کہ لڑکا کہیں کھو گیا

ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ وہ یہیں کہیں ہو گا لیکن وہ بوکھلائے ہوئے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے افتخار سے اُن کی ملاقات ہوئی اور حواس بحال ہوئے۔

فرحت راجہ کے تحفہ کا سنا۔ میں اُس کے تکلف کا قائل نہیں تھا لیکن اگر اس طرح اُس کا دل خوش ہوتا ہے تو ٹھیک ہے۔

اپنی امی جان کی دلدہی کرتی رہنا۔ ہم پرانے وقتوں کے لوگ ہیں جو نئی نسل کے خیالات کو سمجھ نہیں سکتے اور نئی نسل یہ چاہتی ہے کہ جو ہم کہتے ہیں وہی صحیح ہے۔ اس طرح اختلافات کے پہلو نکل آتے ہیں۔ افہام و تفہیم سے کام لیا جائے تو مفاہمت کی راہ نکل ہی آتی ہے۔ اپنی امی جان کو تسلی دینا اور بدستور چوکس رہنا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے اور گھر کا کام چل رہا ہے۔ اپنی امی جان کو میرا اسلام کہنا۔

مس فرحت راجہ کو پیار

خیر طلب
علی عباس

۱۔ بی بی جان: امجد شاہ کی بیگم۔ اصل نام ضیا، تھا۔ احتراماً بی بی جان کہا جاتا تھا۔ عمرہ کرنے گئی ہوئی تھیں۔

۲۔ جرنل شفقات اور جمیل ضیاء بی بی کے بھائی تھے۔

۳۔ ٹیسٹ کروا کر ڈاکٹر نے جو نسخہ تجویز کیا وہ وہی دوا (Urodonal) تھی۔ بس دن میں تین دفعہ پانی میں ڈال کر پینا تھی۔ چند دن میں گردے کی پتھری نکل گئی۔ یہ چند دن ابا جان نے بے حد بے چینی میں گزارے۔ کربوں سے آوازنکلی مبادا اہل خانہ پریشان ہو جائیں۔

جلال پور شریف
۹۔ اگست ۱۹۸۳ء

عزیزہ لالہ رخ! دعائے سلامتی

تمہارا خط ملا جو غالباً تم نے Black mood میں لکھا ہے۔ اس عمر میں تو جوان لڑکیاں بے حد حساس ہو جاتی ہیں یہ قدرتی بات ہے۔ انشا اللہ حالات بدل جانے پر اس کے اثرات بھی دور ہو جائیں گے۔ انتظار کرو اور امید رکھو، انگریزی والے کہا کرتے ہیں اس قسم کے حالات میں "اپنی ٹھوڑی اُونچی رکھو" Keep your chin up۔ جب اس قسم کا موڈ طاری ہو تو جناب امیر مولا مشکل کشا کا تصور کیا کرو کچھ دیر کے بعد طبیعت رُو براہ ہو جائے گی۔ یہ اُن کی زندہ کرامت ہے جس نے خود مجھے نامساعد حالات میں حوصلہ دیے رکھا۔

میرا پہلا خط جو ضائع ہو گیا اور تم تک نہیں پہنچا اسی میں تمہاری امی کا رقعہ بھی تھا۔ وہ تمہاری یاد سے غافل نہیں ہے۔ ماں باپ پر اعتماد رہے اور بھی مشکل سے گزرتی ہے۔

فرحت راجہ کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ اُسے یرقان (اس نے یرکان لکھا ہے) کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے اور وہ منڈی جا کر گلوکوز کی بوتلیں لگوا رہی ہے۔ سرور راجہ کو بخار آتا ہے اور اس کی بیٹی شاہدہ بھی بیماری سے اُٹھی ہے۔ ان حالات میں اُن کا یہاں نہ آ سکنا قابلِ فہم ہے۔

تم نے اپنے خط میں جعفر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ پنڈی میں ہے یا ساہی وال چلا گیا ہے۔ تم اُس کے ساتھ یہاں آ سکتی ہو۔ اکیلی نہ آنا۔ کرایہ نہیں ہے تو لکھنا میں بھجوا دوں گا۔

تمہاری امی کو ٹھوکر لگنے سے اُس کے پاؤں کی انگلیاں متورم ہو گئی ہیں۔ مالش کرتی رہتی ہے۔

عزیز حامد ۴ ستمبر کو جہلم گیا تھا۔ ابھی واپس نہیں آیا۔ اس کی مسز یہیں ہے۔ میری اور تمہاری امی کی جانب سے ساجد حسین، گل شگفتہ، صدف شیریں، عفیفہ زریں اور مہ جبیں کو دعائے سلامتی اور بہت بہت پیارا جعفر کو دعوات۔

فقیر
علی عباس

پس نوشت: تم آ و گی تو تمہاری کوئی نظم منتخب کر کے چھپوانے کے لیے بھیجیں گے۔
مشکل کشا سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

جلالپور شریف

۲۵ اگست ۱۹۸۳ء

عزیزہ لالہ رُخ سلمہا! دعائے سلامتی

تمہارا خط ملا۔ میں نے تمہارے پہلے خط کا جواب لکھا تھا۔ خدا معلوم تمہیں کیوں نہیں مل سکا۔ شاید یہیں سے پوسٹ کرنے والے نے ضائع کر دیا۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم سب لوگ خیر و عافیت سے ہو اور سب بچیاں بھی صحت مند ہیں۔ تمہاری نظم "لمحے" اگست کے "محفل" کے شمارے میں چھپ گئی ہے اور خوبصورت چھپی ہے۔ تم پہلی بار اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ تمہاری دو نظمیں "فنون" میں چھپوانے کے لیے بھیجوں گا۔ اس طرح سال رواں کے آخر تک تمہارا شمار خواتین شعراء میں ہونے لگے گا اور انشاءاللہ نامور ہو جاؤ گی۔ تمہارے امتحان کے بعد تمہارے افسانے بھی چھپنے شروع ہو جائیں گے۔

یہ اچھا ہے کہ تم دونوں بہن بھائی بچیوں کو پڑھا رہے ہو اور تمہارا وقت تفریح اور رونق میں کٹ رہا ہے۔ جعفر کی ملازمت کی کوئی اطلاع تاہنوز نہیں ملی ورنہ میں اُسے مطلع کر دیتا۔ سرور راجہ آئی تھی۔ ایک رات قیام کیا اور کپڑوں کی گٹھڑی چک جانی لے گئی جہاں سے دُھلا کر بھجوا دیئے۔ فرحت راجہ پرچے دے کر آئی تھی۔ بی پرچہ اُس کے لیے بہت مشکل تھا شاید کامیاب ہو جائے۔ میں کچھ زیادہ پُر امید نہیں ہوں۔ اُسے دعاؤں کی ضرورت ہے۔

مسز حامد چند دنوں سے یہیں آئی ہوئی ہے اور ساس بہو میں خاصی مفاہمت پائی جاتی ہے۔ حامد نے اُسے یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ میری صحت بفضلہٖ اچھی ہے۔ ایک بات میں مجھے تم پر رشک آ رہا ہے کہ تم رنگین ٹیلیویژن پر پروگرام دیکھ رہی ہو۔

عزیز ساجد حسین اور عزیزہ گل شگفتہ کو پیار اور دعا۔

صدف شیریں، عفیفہ زریں اور مہ جبیں کو بہت بہت پیار۔ امید ہے کہ صدف خوب لائق فائق ہو گئی ہوگی اور امتحان میں کامیاب ہو جائے گی۔

میری، تمہاری امی اور حامد کی طرف سے ساجد، گل، جعفر کو بہت بہت پیار اور بچیوں کو ڈھیروں

دعائیں۔

مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا کہ تمہیں کون سی چیز لانے کی فرمائش کروں۔ میری ضروریات بہت کم رہ گئی ہیں اور جناب مولا[1] کے کرم سے پوری ہو رہی ہیں۔

دعا گو

علی عباس

۱۔ جناب مولا یعنی امیر المومنین، باب مدینۃ العلم، شیر خدا، ابو تراب، کرم اللہ وجہہ، غازی خیبر، ساقی کوثر، تجلی اعظم، فرد پنجتن پاک، سالار غزوات، پاپند اخلاق و اطوار تحریک نبوت کے بانی، کرار حیدر۔

جلالپور شریف (P.O)
ضلع جہلم

عزیزہ لالہ رُخ سلمہا! دعائے سلامتی

خط ملا۔ ماشاء اللہ عزیزہ کی تحریر میں ادیبانہ شان پیدا ہو گئی ہے اور انشا پردازی کے جوہر اُبھرنے لگے ہیں۔ عزیز ساجد حسین سلمہ کو چھٹی نہیں ملتی تو اسے تکلیف نہ دیں۔ عزیز حامد رضا سلمہ اگست کے پہلے ہفتے میں یعنی چند ہی روز تک راولپنڈی جائے گا اس کے ساتھ چلی آئیں اور عزیز ساجد حسین سلمہ سے پوچھ کر یعنی اگر اُسے تکلیف نہ ہو تو گل شگفتہ کو بھی ساتھ لیتی آئیں۔ یہاں بارش ہو رہی ہے اور موسم خوشگوار ہے البتہ دھوپ نکلے تو حبس ہو جاتا ہے۔

تمہاری امی کی صحت اچھی ہے اور میری طبیعت بھی بحال ہے۔ بحمد اللہ۔ ہم سب کی طرف سے عزیز ساجد حسین سلمہ، عزیزہ گل شگفتہ سلمہا اور ننھی کو سلام دعا۔

عزیز امجد حسین سلمہا اور اُس کے بچوں کو دعائیں۔

دعا گو
علی عباس جلالپوری

درج ذیل خط میری ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گورنمنٹ کالج برائے خواتین میں تعیناتی کے بعد فرحت راجہ سے لکھوایا تھا۔ کیوں کہ ۱۲۔ جون کے فالج کے حملے نے ان کے داہنے ہاتھ کو رعشہ زدہ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ خود خط لکھنے سے قاصر تھے مگر رابطہ رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ ڈھونڈ نکالتے تھے۔

جلال پور شریف

۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء

عزیزہ لالہ رُخ!

سلامت رہو۔ خوش رہو۔ تمہارے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمہیں علیحدہ کمرہ مل گیا ہے اور گیس کے چولہے کی سہولت بھی میسر آ گئی ہے گلے میں خارش ہو تو Strepsil کی ٹکیاں چوسنے سے افاقہ ہوتا ہے۔ بچوں کی کلاس میں زیادہ بولنا پڑتا ہے اس لیے گلے کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ اچھی خبر ہے کہ تمہارا کالج ڈگری ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کو ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور سے انھیں گھر والوں سے نہیں ملتی۔ اگر تمہارا رویہ مروت کا ہوا تو وہ مطمئن رہیں گی اور تمہارے لیکچر کو غور سے سنیں گی۔ ڈگری کالج میں پڑھانا ایک قسم کا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ فروٹ کا تھوڑا بہت استعمال رکھنا لیکن کھٹی چیزوں سے پرہیز لازم ہے۔ یہاں گزشتہ کئی دنوں سے بارشیں ہو رہی ہیں اور موسم میں دوبارہ خنکی آ گئی ہے۔ اُمید ہے کہ وہاں بھی موسم خوشگوار ہوگا۔ آج کل فرحت اور سرور یہاں ہیں اور میری دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ تمہیں بہت یاد کرتی رہتی ہیں۔ سرور نے تمہیں پیار بھرا سلام دیا ہے۔ فرحت الگ خط لکھے گی۔

تمہاری امی خیریت سے ہیں۔ شاہدہ سلام عرض کرتی ہے۔

دعائے سلامتی

ابا جان

درج ذیل خط بھی فرحت رابعہ سے لکھوایا گیا۔

جلالپور شریف

۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء

عزیزہ لالہ رخ!

سلامت رہو۔ شاد رہو۔ تمہارا خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ یہ معلوم کر کے اک گونہ اطمینان اور خوشی ہوئی کہ تمہارے گوجرانوالہ[1] کے تبادلے کے امکانات روشن ہو گئے۔ شاید تمہیں یاد ہو گا کہ تمہاری پیدائش گوجرانوالہ ہی کی ہے۔ وہاں کا کالج بڑا اچھا ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار تم گھر کا چکر بھی لگا سکو گی۔ فرقان صاحب نے کہا ہے کہ میں بہار کی چھٹیوں میں لالہ رخ کے تبادلے کی کوشش کروں گا۔ اُمید ہے کہ اب تک تمہاری صحت بحال ہو چکی ہو گی۔ سرور اور فرحت ابھی یہیں مقیم ہیں۔ شاہدہ کے دو پرچے رہ گئے ہیں۔ پچھلے پرچوں میں اُس نے اپنی قابلیت کے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ تم خط میں لکھنا کہ جلال پور کب پہنچ رہی ہو۔ تاکہ میں اپنا پروگرام بنا سکوں۔ تمہاری امی ہر روز انڈے اُبال اُبال کر کھاتی ہے اُسے خط لکھو کہ ایسا نہ کرے صحت بگڑ جائے گی۔ سرور، فرحت اور شاہدہ کی طرف سے سلام دُعا۔

دعا گو

ابا جان

۱۔ اس وقت میری ٹرانسفر گوجرانوالہ تو نہ ہو سکی البتہ لالہ موسیٰ کے ڈگری کالج میں ہو گئی۔ وہاں سے میں جہلم ہفتہ وار چلی جاتی۔ ابا جان جہلم حامد بھائی کے پاس آ گئے تھے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ابتدائی کارروائیوں کے باعث میری تنخواہ جاری نہ ہو سکی تو ابا جان نے حامد بھائی کے توسط سے مجھے ماہوار رقم بھجوانا شروع کر دی۔ درج ذیل منی آرڈر رسید پر حامد بھائی کے ہاتھوں لکھوایا ہوا نوٹ درج ہے۔

عزیزہ! دعائے سلامتی

امید ہے کہ تم ہر طرح خیر و عافیت سے ہو گی۔ یہاں بھی اللہ کے فضل سے سب بخیریت ہیں۔ امید ہے کہ یہ رقم تمہارے لیے کافی ہو گی۔ تنخواہ کی فکر نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو جاری ہو جائے گی۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ تمہیں ننھے[1] کا نام پسند آیا۔ سب گھر والوں کی طرف سے تمہیں سلام دعا پیار۔

دعا گو
ابا جان

۱۔ ننھے سے مراد شاہ رُخ حیدر ہیں۔ ابا جان میری کمی محسوس کرتے تھے انہوں نے لالہ رخ کے وزن پر شاہ رُخ تجویز کیا۔ امی جان نے خط لکھ کر بتایا تو مجھے بہت اچھا لگا۔

درج ذیل خط ابا جان نے اپنے بائیں ہاتھ سے مشق کرتے ہوئے لکھا۔ موٹے جب کی قلم اور بڑا سادہ صفحہ ہے۔ میں یہ خط جب بھی دیکھتی ہوں تو یہ اُن کی تکلیف کا احساس بھی زندہ کرتا ہے لیکن ساتھ ہی دل کے نہاں خانے میں وہ محبت محسوس کر کے سکون بھی ملتا ہے کہ انہیں مجھ سے کس قدر دلی لگاؤ تھا۔

ج

۱۰-۱۰-۸۲

عزیزہ لالہ رُخ! سلامت رہو خوش رہو

تمہارا خط ملا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم نے کلاسیں لینا شروع کر دی ہیں۔ معروفیت میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ بیکاری میں طرح طرح کے دسوسے گھیر لیتے ہیں۔ میرا فکر نہ کیا کرو۔ میں بھرپور زندگی گزار چکا ہوں، بہت خوشیاں سمیٹی ہیں بہت غم کمائے ہیں۔ بہت حماقتیں کی ہیں لیکن میں پشیمان نہیں ہوں خوش ہوں۔ ترازو کا پلڑا خوشی کی طرف جھکتا ہے یہ کیا کم ہے

اے رفیقِ خیر اندیش میں نے عشقِ جاناں میں
یہ نہ دیکھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا

جعفر صاحب لُبھا گ گئے ہیں۔ بہت دن ہوئے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ تم اس کو خط لکھو اور اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھاؤ۔ شاید وہ قائل ہو جائے۔ یا ساجد کو لکھو کہ گوجر خاں جا کر اُسے سمجھائے اور اس مورکھ سے انکار کی وجہ معلوم کرے۔

سرور آئی تھی اُس کے ساتھ بی بی تھی۔ رات رہ کر چلی گئی۔ تمہاری شکایت کرتی تھی کہ مجھے بھلا دیا ہے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے۔ مناسب سمجھو تو اُسے چٹھی لکھو۔ فرحت نہیں آئی ایک لمبا رقعہ بھیجا کہ میں اگست میں امتحان دوں گی۔ میرا خیال ہے جون جولائی میں ہمارے ہاں رہنے کے لیے زمین ہموار کر رہی ہے تا کہ بی اے کی تیاری کر سکے۔

تمہاری تنخواہ کا کیا بنا؟

مجھے پنجاب اکیڈمی لاہور کی طرف سے علمی خدمات کا سونے کا تمغہ دیا جا رہا ہے۔ ۱۵ کو حامد رضا وصول کرے گا۔ الحمرا میں تقریب ہو گی۔ گورنر تمغہ دے گا۔ میں نے انکار کر دیا تھا لیکن اُن لوگوں نے بہت اصرار کیا اور مجھے ماننا پڑا۔ تمہاری امی کا پسندیدہ واکھان ہے۔

موے[3] تا بے دی...... اُتے مکھن لاتا۔

تمغے والی بات کچھ ایسی ہی ہے۔

علی رضا اور شاہ رُخ ماشااللہ صحت مند ہیں۔ تمہاری امی جان تمھیں الگ خط لکھ رہی ہیں۔

اپنی سہیلی کو دُعا کہنا۔

ع ع

لو بھئی تمغہ آ گیا۔ پانچ تولے کا ہے۔ تمھاری ایم۔ اے کی ڈگری بھی یونیورسٹی کی طرف سے مل گئی ہے۔

* * *

۱۔ جعفر بھائی نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا تذکرہ شد ومد سے کیا ہے۔

۲۔ بجیہ فرحت رابعہ کے ماموں کی بیٹی تھی۔

درج بالا خط سے شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ابا جان کو فالج میں مبتلا ہوئے تقریباً دو برس گزر چکے ہیں۔ کہا کرتے تھے فلسفہ نے مجھ میں صبر و برداشت اور اعتدال سے کام لینا سکھا دیا ہے۔

۳۔ اس اکھان سے پنجاب کے اہلِ زبان ہی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ امی جان کہاوتوں کے بروقت (برمحل) استعمال میں کمال مہارت رکھتی تھیں۔

درج ذیل خط بھی ابا جان نے اپنے دستِ شفقت سے تحریر فرمایا۔

جہلم

عزیزہ! دعائے سلامتی

خط ملا۔ ہم سب خوش ہیں کہ تم آ رہی ہو۔ سفر دن کا کرنا۔ رات کا سفر ہو اور گاڑی ۳ بجے پچھلی رات کو جہلم پہنچے تو زنانہ انتظار گاہ میں ٹھہر کر صبح سات بجے کے قریب تانگہ پکڑنا۔ رکشا نہ لینا اور تانگے کا کوچوان بوڑھا ہو تو بہتر ہے۔ باقی باتیں وقتِ ملاقات۔
میں نے ۲۰ انچ کا سونی کا ٹیلی ویژن رنگین لیا ہے۔ تم دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔
ہم سب تمہارے لیے دعا گو ہیں۔

ابا جان

درج ذیل خط بھی میرے پیارے ابا جان نے اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ اوہ میرے مولا! میں کس قدر خوش نصیب بیٹی ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں ہوسٹل سے گھر پہنچتی تھی تو ابا جان کھڑے ہو کر میرا استقبال کرتے اور دیر تک حال دریافت فرمایا کرتے۔

جہلم

۱۵۔ دسمبر

عزیزہ لالہ رُخ سلامت رہو

خط ملا۔ یہاں بارشیں ہو رہی ہیں۔ جاڑے کا شباب ہے۔ تمھاری امی پنڈی سے واپس نہیں آئی۔ آئے گی تو جلال پور جائیں گے۔ اُمید ہے کہ تمھاری صحت اچھی ہوگی۔ تمھیں کب چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ کب آنے کا ارادہ ہے۔ کپڑے[1] کا بوجھ نہ اُٹھائے اُٹھائے پھرنا۔ فرمائش کرنے والوں کا کیا جاتا ہے۔ بس زبان ہلا دی اور دوسرے کو مصیبت میں ڈال دیا۔ زندگی میں ٹرخانے کا فن سیکھنا بھی ضروری ہے۔ میرے دن بس کٹ رہے ہیں۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

عفت کو بہت بہت پیار۔

علی رضا اور شاہ رُخ ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

ابا جان

۱۔ پہلی تنخواہ ملی تو میں عفت جو کالج میں لائبریرین تھیں اور میری نہایت اچھی دوست بھی، کمالیہ گئے اور وہاں سے سب کے لیے کھدر کے سُوٹ لائے۔ کافی لوگوں نے فرمائشیں کر کے بھی منگوائے۔ ابا جان میری تکلیف کے باعث منع فرمایا کرتے تھے۔

یہاں دل چاہتا ہے کہ میں اپنے پیارے بھائی جان حامد رضا کا بھی ایک دلچسپ خط تحریر کروں جو میرے نام انہوں نے تحریر کیا تھا۔ ان کی تحریر میں ادیبانہ شگوہ موجود ہے جو ان کی مصروفیات حیات نے نگل لیا۔ انہوں نے ابا جان کی خدمت کی پھر امی جان کو بیماری کی حالت میں سنبھالے رکھا۔ یہاں اُن کی بیگم نعمانہ ناہید کے لیے بھی سپاس گزاری کے جذبات ھدیہ کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بشری کمزوریوں کے باوجود دونوں میاں بیوی بزرگوں کی خدمت سے کما حقہ عہدہ برآء ہوئے۔ میرے پیارے بھائی کا خط ملاحظہ فرمایئے۔

جلال پور شریف

۲۹۔۹۔۷۹

ڈیئر رُخی

آج لاہور خط لکھا تو تمہاری باری بھی آ گئی اس لیے سمجھو کہ بروقت جواب دے رہا ہوں۔ دراصل بات کچھ رقم کی بھی تھی اور الیکشن کی بھی۔ رقم کے معاملے میں تہی دست کہ محترمہ کے لباس وزیورات تیار ہو رہے ہیں اور الیکشن کا معاملہ یہ کہ خیر سے بدھو گھر کو آئے والا معاملہ تھا۔ خیر پہیلیاں کیا بجھوائی ہیں...... ہوا یہ ہے کہ ہمیں آرڈر ملا کہ چوآ سیدن شاہ کے قریب صرف دو میل ادھر ایک کچے راستے پر ایک گاؤں منہالہ نامی جو قدرے بلندی پر ہے، آپ کی تعیناتی بطور پریزائڈنگ افسر کے طور پر ہوئی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بھاگم بھاگ تحصیل پہنچے جہاں ایک مہر شدہ تھیلا تھمایا گیا کہ سارا سامان اس کے اندر ہے۔ لو دستخط کرو۔ کیا کرتے ایسا ہی کیا۔ خدا بھلا کرے منتظمین کا کہ ایک سپیشل بس میں ہم الیکشن والوں کو ٹھونس کر لے جایا گیا اور ایک موڑ پر اتار دیا گیا۔ ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے میں تھیلا لیے ہم بڑی شان سے اترے مگر افسوس کہ کوئی استقبال کرنے والا نہ تھا حالاں کہ ایک ماسٹر صاحب کی ڈیوٹی ہم نے لگائی تھی کہ وہاں آنا اور رہنمائی کرنا مگر وہ بھی کہتا ہوگا کہ تو بھی تو ماسٹر ہی ہے کالج میں پڑھاتا ہے تو کیا ہوا؟ ہم پر حکم نہیں چلے گا۔ خیر ایک بوڑھے سے راستے کا پوچھا بیگ و تھیلے کو کندھے پر لادا اور پہاڑی راستے پر دھول اڑاتے ہوئے گامزن ہوئے۔ کوئی دو میل کے اتار چڑھاؤ کے بعد بلندی پر گاؤں نظر آیا۔ دور سے کئی دفعہ آدمی آتے ہوئے نظر آتے اور ہم سمجھتے کہ ہمارے لیے آرہے ہیں مگر قریب آ کر وہ بے اعتنائی سے آگے چلے جاتے تھے۔ چار و نا چار چڑھائی چڑھ کے گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا کہ سکول تو دوسری

طرف نشیب میں ہے۔ یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور سکول میں بیٹھے ہی تھے پیغام ملا کہ کسی صوبیدار صاحب نے انتظام کر رکھا ہے ان کی بیٹھک میں آ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن اس وقفہ طوفان بادوباراں کے تھپیڑوں نے ہمیں ان کی بیٹھک میں بہت جلد پہنچا دیا جو بلا مبالغہ پون میل گاؤں سے پرے تھی۔ یقین جانو یہ علاقہ بہت بلندی پر ہے۔ ہم نے تو باقاعدہ سردی سے کانپنا شروع کر دیا فوراً کپڑے بدل کر بستر میں گھس گئے۔ آہستہ آہستہ میرا عملہ دور نزدیک کے سکولوں سے آتا گیا اور محفل گرم ہو گئی اور کچھ دیر کے بعد تو ماسٹروں نے حسب عادت دنیا کے تمام مسائل پر گفتگو کر ڈالی۔ کچھ مسائل ابھر گئے اور قرین قیاس میں تھا کہ اساتذہ کرام اپنی جیتجم دھاڑ میں انھیں اور ابھار دیتے اور جوتا چل جاتا، کھانا آ گیا اور ان اصحاب کی توجہ بٹ گئی۔ مجھے تحصیل سے ایک ضخیم کتابچہ الیکشن کے بارے میں ملا تھا۔ چیدہ چیدہ نکات پڑھے پچھلا تجربہ آڑے آیا۔ لیکن پھر بھی ایسے طالب علم کی طرح اسے پڑھتا رہا جس نے صبح امتحان دینا ہوتا ہے۔ میرے ماتحت عملہ میں دو تین اصحاب بہت خوف زدہ تھے انھوں نے جب گاؤں کے نمبردار و امیدوار چلے گئے تو بتایا کہ اس گاؤں میں تو بہت خون آشام لوگ رہتے ہیں۔ بات بات پر قتل اور فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ تو بیک وقت ۹ جنازے قبرستان پہنچے تھے (ہوا یہ کہ پانچ آدمیوں کو پھانسی لگی۔ دو فوج سے مر کر آئے اور دو گاؤں میں ہی اللہ کو پیارے ہوئے)۔ خیر میں نے انھیں تسلی دی کہ فکر نہ کرو ہم تو غیر جانب دار ہیں۔ الیکشن کروانے آئے ہیں ہم پر تو وہ اپنی گولیاں ضائع ہی کریں گے ہماری ان کے ساتھ دشمنی تھوڑی ہی ہے اور خوف کو دور کرنے کے لیے چند قہقہے بھی لگائے لیکن اپنی کپکپاہٹ کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے فوراً کہا بھئی آج تو سخت سردی ہے۔ ماحول یکا یک خوفناک ہو گیا۔ گہری گھٹائیں امڈ آئی تھیں۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تھی ہم دعا مانگتے تھے کہ بارش ہو اور ایسی ہو کہ سکول بھی بہہ جائے زلزلہ آ جائے نفسا نفسی ہو جائے اور الیکشن کا خیال ہی کسی کو نہ رہے اور ہماری جان بچ جائے لیکن ایسا کہاں ہو سکتا تھا۔ پہاڑی کی بلندی پر سائیں سائیں ہوائیں چل رہی تھیں جیسے لاکھوں چڑیلیں شور مچا رہی ہوں۔ بجلی کی چمک میں سامنے پہاڑیاں بھی عجیب و غریب بھوت بن کر نظر آ رہی تھیں۔ مکان کے ساتھ ہی کھائی تھی جس میں سے ہوا سیٹیاں مارتے ہوئے گزر رہی تھی۔ میں نے لحاف میں منہ دبایا اور تقدیر پر غور کرنے لگا کہ بُرے پھنسے۔ کہاں لاہور کہاں جلالپور اور کہاں یہ تہذیب سے دور ویرانہ۔ ہائے قسمت تیری تو قضا تجھے یہاں لے آئی۔ اب کف افسوس ملنے سے کیا ہوگا۔ اب تو اس دیارِ غیر میں دسویں قبر کا اضافہ ہوگا! ان لوگوں کو خواہ مخواہ شک ہو گیا کہ یہ افسر تو جانب دار ہے تو خیر نہیں۔ خیر انھی سوچوں میں رات گزری۔ صبح کا اجالا پھیلا تو فوراً اٹھے تیار ہو کر ناشتہ کیا اور بمعہ عملے سوئے مقتل (معاف کرنا سکول) چلا۔ میٹھی دھوپ

پھیلی ہوئی تھی۔ فوراً تو تھڑے بنائے گئے اور عملے کو مستعد کیا امیدواروں کے ایجنٹ صندوقچیاں لے آئے انھیں مہریں لگا کر بند کیا سکول کے صحن میں سارا گاؤں عورتوں بچوں اور لمبی مونچھوں والے جوانوں اور بوڑھوں سے بھرا ہوا تھا۔ کام شروع کر دیا گیا۔ مابدولت ایک کمرے میں دبک گئے۔ ڈر گئے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ یہ عورتوں کو گھورتا ہے اور پھینکوا سے اٹھا کر کھائی میں۔ بارے پتہ چلا کہ عورتوں کے بعد اب مردوں کی باری ہے۔ چنانچہ باہر آ کر دیکھا لیکن خلاف توقع بندوقیں نظر نہ آئیں۔ اتنے میں نمبردار نے آ کر بتایا کہ فکر نہ کریں گاؤں والوں نے سمجھوتا کیا ہے اور ایک ہی امیدوار کو وہ ووٹ ڈالیں گے۔ بالکل امن و امان رہے گا کیوں کہ وہ اپنے امیدار کو زیادہ سے زیادہ ووٹ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ بھلے یکا یک ایسے لگا کہ موسم حسین ہو گیا ہے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نگاہ قدرتی نظاروں میں کھو گئی۔ سفیدی مائل پہاڑیوں پر سبز جھاڑیاں جیسے قالین پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ ادھر ادھر سفید سفید بدلیاں ہوا میں تیر رہی تھیں۔ طرح طرح کے پرندے جھاڑیوں میں اڑتے ہوئے مدھر نغمے بکھیر رہے تھے۔ سامنے لوگ جیسے آج سے صدیوں سے پہلے جیسے لوگوں کی طرح تھے جنھوں نے یہاں زندگیاں گزاری تھیں۔ دراز قد مضبوط جسموں والے جفاکش پہاڑی لوگ جن کا شیوہ مہمان نوازی اور خودداری ہے۔ قریب تھا کہ میں مسرت سے ناچنے لگتا میرے عملے کے ایک ماسٹر صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جیسے مجھے تصورات کی دنیا سے نکال لیا وہ بھی بہت خوش تھے۔ پھر تو کام پلک جھپکنے میں نمٹ گیا اور سورج غروب ہوتے ہوتے ہم کمروں سے باہر نکلے اور حسین وادی سے ہوتے ہوئے چوآ سیدن شاہ پہنچ گئے اور آج بلکہ اس وقت وہ سارا عرصہ اک خواب کی طرح محسوس ہو رہا ہے۔ اب تم سناؤ کہ کیسی رہی ہماری آپ بیتی۔ اب تازہ ترین سنو کہ میں دو تین دن تک ٹرک لے کر لاہور جا رہا ہوں۔ سامان بمعہ بزرگ آنے ہیں۔ پھر اس کے بعد گجرات و جلال پور سیداں کا چکر لگے گا۔ ظاہر ہے خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا — اچھا والسلام

تمھارا بھائی

حامد رضا

۱۔ حامد بھائی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

جہلم

۳۰ ستمبر ۱۹۹۰ء

برادرِ مکرم سید[1] صاحب! اسلام علیکم

مکرمت نامہ مل کر باعثِ مسرت ہوا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ مجھے بھی بعض عزیزوں سے استصواب کرنا تھا نیز عزیز القدر ساجد حسین شاہ کی علالت ہم سب کے لیے باعثِ تشویش رہی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اب وہ رُو بصحت ہے۔ میرے خیال میں آپ کی تشریف آوری ۱۶ نومبر بروز جمعہ مناسب رہے گی۔ اُمید ہے کہ آپ اس پر صاد کریں گے۔ ایسے موقع پر آپ کے ہاں جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ بھی وضاحت سے لکھ بھیجیں نیز مطلع کریں کہ کتنے حضرات اور کتنی خواتین آپ کے ہمراہ ہوں گی۔

عزیزہ سعیدہ[2] کے بیٹے کی پیدائش پر انہیں اور آپ سب کو ہم سب کی طرف سے دلی مبارک باد اور دعائے درازیٔ عمر۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

---

[1] سید مراد علی شاہ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بیٹے انجینئر سید اعجاز علی بخاری سے لالہ رُخ کی نسبت طے ہونے کے بعد رسمِ منگنی کی ادائیگی کے لیے خط لکھا۔

[2] سعیدہ صاحبہ، سید مراد علی شاہ کی بڑی صاحبزادی ہیں۔

جہلم

۹ فروری ۱۹۹۱ء

برادرِ مکرم! سلام مسنون

آپ کا مکرمت نامہ مل گیا تھا۔ رسمِ بازدید کے لیے ہم سب کے خیال میں ۲۲ فروری[1] کا دن بہتر رہے گا کیوں کہ اس وقت تک موسمِ سرما کی شدت رفع ہو جائے گی۔ اُمید ہے آپ اس تاریخ پر صاد کریں گے۔ مطلع کیجیے کہ آپ کو یہ تاریخ منظور ہے۔ اگرچہ خلیج کی جنگ نے ناصبیوں کے عزائم سرد کر دیے ہیں لیکن ابھی جھنگ کے شہر میں ان کی شرانگیزیاں جاری ہیں۔ اس لیے اس بارے میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ سب خواتین و حضرات قرینِ عافیت ہوں گے۔

ہماری طرف سے دعائیں

مخلص

علی عباس جلالپوری

۱۔ جناب سید مراد علی شاہ کی والدہ کا انتقال ہونے کے باعث یہ تاریخ ملتوی ہو گئی اور بعد ازاں ۱۰ اپریل ۱۹۹۱ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ لالہ رخ اور اعجاز بخاری ۱۰ اپریل کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

درج ذیل ابا جان کے وہ خطوط ہیں جو آپ نے وقتاً فوقتاً خود تحریر کیے ہیں یا پھر حالت مرض میں مجھ سے لکھوائے ہیں۔ درج ذیل خط آپ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ ژف کاغذات میں رہ گیا اور نوک پلک سنوار کر پوسٹ کر دیا گیا۔

جلال پور شریف (P.O)
ضلع جہلم۔ پاکستان
۱۱ اگست ۱۹۸۰ء

بھائی جگتار سنگھ جی!

وسدے رہو! سکھی رہو۔ پنجابی ادبی بورڈ لاہور دلوں میںوں سید سبط الحسن ضیغم دا چٹر ملیائے جس وچ اوہناں دسیائے کہ تسیں میری پنجابی کتاب "وحدت الوجود تے پنجابی شاعری" نوں گورمکھی لپی وچ چھاپ رہے او۔ ایہہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تساں میری کوشش نوں سلاہیائے تے ایس نوں گورمکھی وچ چھاپن دا جتن کر رہے او۔ ایس کتاب وچ کجھ غلطیاں رہ گیاں سن۔ اوہ میں ایسے چٹر نال بھیج رہیا ہاں۔ کرم کریو تے ایہناں نوں درست کروا دیویو۔
ہور وی کوئی غلطی رہ گئی ہووے تے اوسنوں درست کر دیناں۔ بندہ بھُلن ہار اے کجا ڈوڈھ بے پیتا ہویوس۔
اج کل میں پنجابی ٹریجیڈی تے اک پنجابی ڈکشنری تے کم کر رہیا ہاں۔ ویکھو کی بندے۔ موت نے ویل وتی تے شید توڑ جاوت۔

تہاڈا
علی عباس جلالپوری
(ریٹائرڈ پروفیسر)

۱۹۸۳ء میں فنون میں چھپنے والا خط

سید علی عباس جلالپوری
جہلم

''میری غزل'' کے مطالعے سے حظ اندوز ہوا۔ کتاب[1] میں اچھے اشعار تو بہت ہیں۔ لیکن جو خاص طور سے مجھے پسند آئے وہ درج ذیل ہیں

وجود اپنے تغیر سے عدم تخلیق کرتا ہے
مرے ہر سانس سے پیدا عدم ہوتے ہی رہتے

......

ہم کو معلوم ہے دو دن کی بہاروں کا فریب
ہم نے دیکھا ہے گلستاں کا بیاباں ہونا

......

کتنی آسان ہے احسان فراموشی بھی
کتنا دشوار ہے شرمندۂ احساں ہونا

......

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لیے دنیا میں
میں نے ہر شخص پہ الزام لگانا چاہا

......

خدا ہو یا کوئی بت ہو کوئی تو ایسا ہو
جو دل کی بات کہے اور دل کی بات سنے

......

۱۔ یہ اشعار کرار نوری کے ہیں اور کتاب کا عنوان ہے ''میری غزل''

نہ جانے کس کے تبسم میں تم ابھر آؤ
چمن میں، میں نے ہر اک پھول کو سلام کیا

آشیانے سے بھی اب بُوئے قفس آنے لگی
دوستو! کیسی ہوا اب کے برس آنے لگی

......

ایک ذاتی کرب نے رُخ ہی بدل کر رکھ دیا
بن رہے تو شاخِ گل اور بن گئے تلوار ہم

......

ساتھ میرے تھا رہبروں کا ہجوم!
کس طرح گم ہوئی ہے راہ نہ پوچھ

فالج کے حملے کی خبر جلالپوری کے دوست سبط الحسن ضیغم کو مضطرب کر گئی۔ انہوں نے تالیفِ قلب کے لیے خط تحریر کیا۔ جس کے جواب میں ابا جان نے مجھ سے یہ خط تحریر کروایا۔

سید علی عباس جلالپوری معرفت
پروفیسر حامد رضا
مکان چودھری عظمت اللہ۔ کچہری روڈ
ایوا محلہ۔ نزد سیشن کورٹ۔ جہلم
۱۰-۱۰-۸۴

سجن جی اوسدے رہو

تہاڈا پتر مل گیا ہے۔ مزاج پرسی دا شکریہ۔ دو مہینے میری حالت خراب رہی اے پر ہُن ٹھیک پیا ہاں۔ مرض دا حملہ سجے پاسے ہویا سی۔ سجی لت ٹھیک ہو رہی اے پر سجی بانہہ اجے دا ہیں پئی دیندی۔ سجے ہتھ نوں رعشہ ہے ایس واسطے ایہہ پتر اپنی دھی کولوں لکھوا رہیا ہاں۔ میرے واسطے دعا کرو۔ ساریاں بیلیاں تے سنگیاں، خاص طور تے صادق صاحب نوں سلام۔ اج کل میں جہلم اپنے وڈے جاتک کول مقیم ہاں۔

طالب دعا
علی عباس جلالپوری

جہلم
۱۶ اگست ۱۹۸۵ء

مشتاق احمد صاحب

''دشتِ نوا'' مل گئی ہے۔ میں نے اسے غور سے پڑھا۔ مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ آپ کے ہاں حسنِ تغزل کے ساتھ شعورِ عصر اور انقلابیت کے بھی واضح نشان ملتے ہیں جو آج کل کے اہمال اور ابہام کے زمانے میں یقیناً میرے جیسے لوگوں کے لیے تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ آج کل شاعری کے مدعی تو بہت ہیں لیکن میرے خیال میں ان میں اکثر متشاعر اور تنگ بند ہیں۔ ان میں ترقی پسندی اور انقلابیت کے عناصر بھی کم ہی ملتے ہیں۔ ان حالات میں آپ کا کلام اہلِ نظر کو متاثر کرے گا جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہیں کہیں عروض کی خامیاں بھی ہیں لیکن مشق جاری رہی تو یہ از خود دور ہو جائیں گی۔ آپ کے کلام پر تبصرے بھی دیکھے جو مجھے سطحی اور سرسری لگے۔ آپ کے کلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ''دشتِ نوا'' میں مندرجہ ذیل اشعار مجھے خاص طور پر اچھے لگے۔ ان میں مجھے فکر کی تازگی اور بیان کی شگفتگی کے آثار دکھائی دیے۔

طالبِ خیر
علی عباس جلالپوری

جب کوئی غاصب اُٹھا اور صدرِ ملت بن گیا
جب کوئی ننگِ زمانہ فخرِ اُمت بن گیا
ایسی تاریکی میں اکثر یاد آئے ہیں حسینؑ

......

آؤ ماضی کے حسیں دام کے حلقے توڑیں
کون پابندِ طلسمات رہے گا یارو

......

جو کوئی رات کو دن کہنے پر تیار نہیں
وہ میرے دیس میں رہنے کا سزاوار نہیں

......

لگی ہے بلبلوں کے چہچہانے پر بھی پابندی
گلستان آج زیرِ پنجۂ صیاد ہے ساقی

......

تمہاری ذات سے پھیلی ہے تیرگی ہر سُو
تم اُٹھ کے بزم سے جاؤ کہ روشنی پھیلے

......

سخت مشکل ہے بیاں دردِ نہاں کا ہونا
جرم ہے آج کسی منہ میں زباں کا ہونا

......

سب کو اک خون کی زنجیر میں جکڑے دیکھا
ایک زنداں سا لگا اپنا وطن بھی مجھ کو

......

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ مجبوری یہ مایوسی
ہمیشہ کے لیے اس قوم کی قسمت نہ بن جائے

......

وقت جو زہر پلائے گا پیے جاؤں گا
مجھ کو ہر حال میں جینا ہے جیے جاؤں گا

......

میرے ہی سجدہ ہائے جنوں سے خدا بنے
میرے ہی حال سے ہیں وہ غافل کہوں تو کیا

اُس کی نگاہِ ناز کا جادو بجا مگر
لٹنے پہ دل تھا آپ ہی مائل کہوں تو کیا

......

تیرگی چھٹ بھی چکی نورِ سحر پھیل گیا
قافلے والو چلو اب تو تامل نہ کرو

زندگی کچھ بھی نہیں جہدِ مسلسل کے سوا
ہاں طلب اپنے لیے راحتِ منزل نہ کرو

......

جہلم

علی عباس جلالپوری معرفت

پروفیسر حامد رضا

۳۰-۴-۹۰

جناب گلباز آفاقی! سلام مسنون

آپ نے پاکستان ٹائمز میں میرے بارے میں جو شذرہ تحریر کیا تھا اس کا تراشا ایک دوست نے بھیجا ہے جسے پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کی تحریر معروضی ہے اور آج جبکہ لوگ عقلی علوم کے بارے میں لکھنے سے گریز کرتے ہیں اور نقلی علوم کی دو چار کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو علامہ سمجھتے ہیں، آپ کا فکری رویہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں انسان کے جذباتی پہلو سے زیادہ اعتنا نہیں کرتا صرف ایک حد تک درست ہے۔ میری تحریروں میں البتہ وجدان کے بارے میں یہ خیال ضرور ملتا ہے کہ وجدان اپنے اظہار میں عقل و خرد کا محتاج ہے اور عقل و خرد کی برتری قائم کرنے کے لیے وجدان کو اپنے مقام پر رکھنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں میں ''اقبال کا علم کلام'' کے ایک باب کا حوالہ دوں گا جس کا عنوان ہے ''اقبال اور تقابل عقل و وجدان'' اور ''عام فکری مغالطے'' میں بھی اس موضوع سے بحث کی گئی ہے میرے مکالمے مطبوعہ ''راوی'' میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۔ فوٹو میں میرے ساتھ میرے پوتے بیٹھے ہوئے ہیں، نواسے نہیں۔ ۲۔ گورنمنٹ کالج میں میرا قیام (۱۹۳۳ تا ۱۹۳۵) تک تھا۔ ۳۔ میرے ٹیوٹر کا نام Heth تھا۔ ۴۔ سنگیت گندھرو مہا دیالہ راوی روڈ پر پنڈت جنار دھن نے قائم کیا تھا۔ ۵۔ میں نے فلسفے کا ایم۔اے پرائیویٹ کیا تھا، کیوں کہ فلسفے کے استاد فلسفے کو مذہب کی کنیز قرار دینے پر اصرار کرتے تھے۔ ۶۔ فیض مرحوم کے ساتھ میرا ربط و تعلق اس وقت پیدا ہوا جب وہ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ہماری علمی دنیا کا المیہ یہ ہے کہ فیض مرحوم نے فلسفے کے ایم اے کی بجائے عربی میں ایم اے کیا۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا کہ میں تو فلسفے میں ایم اے کرنا چاہتا تھا مگر اس میں کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ ناچار میں نے ایم اے عربی کر لیا۔

۷۔ احمد شاہ بخاری مرحوم نے اقبال مرحوم سے یہ کہا تھا کہ آپ نے خودی کا فلسفہ نطشے سے لیا ہے۔ اس کا کوئی جواب اقبال مرحوم سے نہ بن پڑا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ فلسفہ میں نے مولانا روم اور قرآن

مجید سے اخذ کیا ہے۔ یہ صریح دھاندلی تھی۔ فرانس کے قاموسیوں میں سے اہم کام دیدرو نے کیا تھا۔
میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے — میں نے فشٹے کہا تھا آپ نے اُسے نیٹشے سمجھ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماؤف ہونے کے باعث میری زبان آج کل صاف نہیں رہی۔ آپ نے لکھا ہے کہ existence کا ترجمہ "موجود" ہے۔ یہ غلط ہے۔ "موجود" existent کا ترجمہ ہے۔

۸۔ آپ کی فرمائش پر میں نے ایک غزل کے چند اشعار لکھوائے تھے۔ اس کا چوتھا شعر غلط ہے وہ یہ تھا۔

کیسی کیسی روشن شمعیں آنکھوں کی بے نور ہوئیں
کیسے کیسے چاند سے چہرے گہنائے غمناک ہوئے

اس میں ایک اور شعر بھی تھا۔

راکھ کریدی کچھ نہ ملا بے چارے غم کے ماروں کو
پیار کے انگارے کملائے جلتے بجھتے خاک ہوئے

اسی طرح ایک اور شعر غلط لکھا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے۔

تلخ ہے جام زندگی سید
ہم اسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں

شفقت اللہ صاحب اور ظہور احمد[1] صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔ اُن کے چہرے پر داڑھی دیکھ کر میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

فقیر
علی عباس جلالپوری

۱۔ ظہور احمد ایڈیٹر "راوی" ادبی مجلہ گورنمنٹ کالج لاہور۔

سید علی عباس جلالپوری

معرفت پروفیسر سید حامد رضا

ایوا محلہ، کچہری روڈ۔ جہلم

۶ جنوری ۱۹۹۰ء

چودھری محمد امین!

آپ کا مبارک باد کا خط ملا۔ شکریہ۔ ایوارڈ[1] ملنے پر جلال پور شریف کا نام روشن ہوا۔ مجھے اس بات کی وڈی خوشی ہے۔ امید ہے آپ اپنے لواحقین سمیت صحت و عافیت سے ہوں گے۔

زحمت دے رہا ہوں۔ ''ڈلی والے کھوہ'' اور ''وڈے بنّے'' پر ہماری کچھ اراضی ہے۔ جس میں ۱/۳ حصہ سید امتیاز احمد اور اس کے بھائیوں کا ہے اور ۲/۳ حصہ میرے نام ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اشتمال کے بعد ہماری اراضی کے ٹکڑے ایک جگہ ہو گئے تھے۔ ''وڈے بنّے'' پر ایک بیگھ زمین بھائی محمد شاہ کی تھی اس کو نکال کر باقی اراضی کے ۲/۳ حصے ہمارے ہیں۔ مہربانی کر کے معلوم کریں کہ اراضی اکٹھی کرنے پر کتنا خرچہ آئے گا اس بارے میں آپ اطلاع دیں گے تو میں ممنون ہوں گا اور خرچے کا ۲/۳ حصہ میں ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ جو واجبات ہیں وہ بھی لکھ بھیجیں۔ عزیز حامد رضا رقم لے کر آپ سے ملے گا۔

میری طرف سے دعائے خیر۔ آپ کا بیٹا تو ماشاءاللہ بڑا ہو گیا ہوگا۔ اس کو پیار۔ خط مندرجہ بالا پتے پر لکھیے گا۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

---

[1] ''خرد افروزی'' کے لیے مسلسل کام کرنے پر محترمہ بے نظیر بھٹو جو اس وقت وزیر اعظم تھیں، نے ابا جان کو ایوارڈ دیا۔ حامد بھائی جان وصول کرنے اسلام آباد کی تقریب میں شریک ہوئے۔ [2] چودھری محمد امین جلالپور شریف میں ابا جان کے معتقد افراد میں شامل تھے۔ [3] محمد شاہ کے تین بیٹے تھے امتیاز احمد، اشتیاق احمد، امام شاہ۔ [4] سگے بھائی علی عباس جلالپوری اور سید اصغر علی تھے۔ [5] ابا جان کو ایوارڈ ملا تو میں بھی مبارک باد دینے لالہ موسیٰ سے جہلم گئی۔ میر انجا ولد تو ہر ٹیک سنگھ سے لالہ موسیٰ ہو گیا تھا۔ باتوں باتوں میں ابا جان کہنے لگے میرے ایک کرم فرما خالد اختر صاحب نے طنزیہ کہا کہ آپ نے لینن پرائز کے لیے لکھا ہے تو میں نے جواباً شعر پڑھا۔

بے نیازانہ ز ارباب کرم می گزرم
چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گزرد

وہ صاحب حیران ہوئے اور دریافت کیا اس کا کیا مطلب ہوا؟ میں نے کہا اس کا مطلب کسی بے نیاز عالم سے پوچھیے — اس پر وہ خفیف ہو گئے۔

پروفیسر سید علی عباس جلالپوری معرفت
پروفیسر سید حامد رضا
ایوا محلہ کچہری روڈ۔ جہلم

۱۴ دسمبر ۱۹۸۹

محترمی ندیم صاحب! اسلام مسنون

ایوارڈ کی مبارک باد کا شکریہ۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ فلسفے کو مستقل بالذات حیثیت دی گئی ہے۔ غزالی سے لے کر اقبال تک ہمارے اہل علم نے فلسفے اور سائنس کو مذہب کی غلامی میں دے دیا اور عقلیت کو وجدان پر قربان کر دیا۔

آج سے بیس برس پہلے میرا ایک مضمون "دنیائے اسلام میں خرد افروزی" شائع ہوا تھا جس میں خرد افروزی اور عقلیت پسندی کی دعوت دی گئی تھی۔ خرد افروزی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مجلسوں میں عقلی و تحقیقی علوم سے اعتنا کرنا عملاً ممنوع سمجھا گیا۔ آج کل اسلامی فلسفہ اور اسلامی سائنس کا عام چرچا ہے لیکن کسی اہل علم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ اسلامی فلسفہ اور اسلامی سائنس کا مطلب کیا ہے۔ عقلیت پسندی کو ہمارے دینی دانش وروں نے تاویلات کے وسیلے سے پامال کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ فہد نے برملا یہ کہا کہ اہل مغرب سائنس میں ایجادات کرتے ہیں جبکہ ہم نے روحانیت کے میدان میں زبردست ایجادات کی ہیں۔ یہ بات ایک ایسا شخص ہی کہہ سکتا تھا جو علوم جدیدہ سے بے بہرہ ہو۔ لوگ میری فکر کو خاموشی کی سازش سے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

یہ دیکھ کر اطمینان ہوا ہے کہ بعض ذہین نوجوانوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا ہے چنانچہ اس ایوارڈ کی صورت میں فلسفے کے حقیقی مقام کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک بات خاص طور سے میرے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ یہ ایوارڈ فلسفے کو دیا گیا ہے۔

ایک بات البتہ تشویشناک ہے کہ کچھ لوگوں نے مبارک باد کے خطوط میں مجھے علامہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ منظور احمد صاحب کا پتہ نہیں مل سکا ورنہ میں اُن کو شکریے کا خط ضرور لکھتا۔

فقیر

علی عباس جلالپوری

جہلم

۹۰-۱-۶

برادرم ندیم صاحب! اسلام مسنون

فنون کا تازہ پرچہ مل گیا ہے۔ شکریہ۔ ماشاءاللہ مشمولات کے لحاظ سے یہ پرچہ معیاری ہے۔
اسے دیکھ کر ایک شعر یاد آیا۔

آپ کی بزم میں سب کچھ ہے مگر داغ نہیں
آج وہ خانہ خراب ہم کو بہت یاد آیا

فقیر
علی عباس جلالپوری

جہلم

۹۰-۱-۶

جناب قاضی[۱] صاحب! دعائے سلامتی

آپ کا مبارک باد کا خط ملا۔ اسے دیکھ کر نہ صرف میری آنکھیں روشن ہوئیں بلکہ دل کو بھی تقویت پہنچی۔ بہت بہت شکریہ۔

فقیر
علی عباس جلالپوری

۱۔ قاضی محمد صدیق۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ ڈپٹی ضیر مکڑوال

جہلم

۹ فروری ۱۹۹۱ء

مکرمی جناب ڈاکٹر ملک صاحب! اسلام مسنون

آپ کی دوسری معلومات افزا کتاب مل گئی تھی۔ افسوس ناسازیٔ طبع کی وجہ سے میں اس کی رسید نہ بھیج سکا۔ مجھے آپ کے بنیادی افکار سے کلی اتفاق ہے اور میں آپ کو ان قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور آپ کی جرأتِ اظہار کی داد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی کتب کا مطالعہ نئی نسل کے نوجوانوں کو متاثر کرے گا اور وہ حقائق کی ترجمانی خرد دوستی کے حوالے سے کریں گے۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

فقیر

علی عباس جلالپوری

جہلم

۱۷جون۱۹۹۱

مکرمی ایم سلیم صاحب! اسلام مسنون

آپ کی کتاب ''جدید فلکیات'' مل گئی تھی۔ میں فلکیات کا عالم تو نہیں ہوں لیکن اس مضمون میں دلچسپی ضرور رکھتا ہوں۔ ایک مدت ہوئی میں نے James Jeans کی مشہور کتاب "Mystery of Universe" پڑھی تھی اور کائنات کی بے پناہ وسعتوں سے وقوف حاصل کیا تھا۔ آپ کی کتاب بلاشبہ ایک قابلِ قدر علمی کاوش ہے۔ آئن سٹائن کا نظریہ بھی میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک سائنس میں جتنے بھی انکشافات ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں فلسفے کے اصولوں کے ساتھ منسلک کر کے پڑھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ میں شاید ان دونوں علوم کے ربط و تعلق پر ایک کتاب لکھتا مگر فالج اور رعشہ کے باعث میں اس طرح توجہ نہیں دے سکا۔ ہمارے ارباب علم کئی صدیوں سے سائنس اور فلسفہ کو مذہب کی کنیز سمجھتے رہے ہیں۔ اسی کج فکری نے ہمارے ہاں عقلیت کی تحریکوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ آج سے ۲۰ برس پہلے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''دنیائے اسلام میں خرد افروزی کی ضرورت'' بعد میں یہ مقالہ میری کتاب ''اقبال کا علمِ کلام'' میں شائع ہوا تھا۔ افسوس کہ میں اب از کار رفتہ ہوں۔ لکھنے سے قاصر ہوں اور خطوط کا جواب دینے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے اور ڈاکٹر ملک صاحب نے میری کچھ کتابیں پڑھ لی ہیں اور آپ حضرات کی حوصلہ افزائی میرے لیے تقویتِ قلب کا باعث بنی۔

اُمید ہے کہ ڈاکٹر ملک صاحب اور آپ کی تحریریں نوجوانوں تک پہنچ جائیں گی۔ میں خط دیر سے لکھ رہا ہوں اس کی وجہ میری معذوریاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔

فقیر

علی عباس جلالپوری

جہلم

۱۵ نومبر ۱۹۹۰

مکرمی ڈاکٹر صاحب! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ بھی تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں۔ میری کتاب "عام فکری مغالطے" سے آپ حوالہ دے کر اقتباس لے لیں۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

جہلم
۸ ستمبر ۱۹۸۵

عزیزہ نبیلہ[1] دعائے سلامتی

آپ کا خط ملا۔ جس محبت بھرے پیرائے میں آپ نے میری صحت کے بارے میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے اُس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ اس بات کی خوشی ہے کہ آپ میری تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں۔ ایک برس گزرا مجھ پر فالج گرا تھا۔ ابھی تک اس موذی مرض کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑھاپے کا فالج علاج پذیر نہیں ہوتا لیکن ناامید ہونا اور ہراساں ہونا میرے مسلک کے خلاف ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہم لوگ جہالت، تعصب اور رجعت پسندی کے اتھاہ اندھیروں میں روشن خیال اور عقلیت پسندی کی شمع جلائے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ موت کو ایک دن آنا ہی ہے۔ کیوں نہ زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کے لیے وقف کر دیا جائے مجھے اگر افسوس ہے تو یہی ہے کہ داہنے ہاتھ میں رعشہ ہو جانے کے باعث میں لکھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ یہ خط بھی اپنی بیٹی عزیزہ لالہ رُخ سے لکھوا رہا ہوں زمین دوز تاریکیوں میں کھو جانے سے پہلے ہم اپنا پرچم آپ جیسی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو دے جائیں گے جو اسے کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ آپ اس صبح بہار کو ضرور دیکھیں گی جس کے لیے ہم لوگ خزاں کے تھپیڑے سہتے رہے ہیں اور کش مکش کرتے رہے ہیں۔ جاپان کے خلاف لڑتے ہوئے لانگ مارچ کا کوئی سپاہی گولی کھا کر گرتا تو وہ اپنی سرخ ٹوپی اپنے کسی ساتھی کو دے کر کہتا، "لو بھی ہم تو چلے، تم اس کی لاج رکھنا"۔ یہی حالت ہماری ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ مرنے سے پہلے جو مشعل ہم آپ کو دے کر جائیں گے اُسے آپ زندگی بھر فروزاں رکھیں گی۔

زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیجیے کیوں کہ علم انسان کے دماغ کو روشن کرتا ہے اور اُسے راہِ عمل متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اتنی چھوٹی عمر میں زندگی کے بارے میں آپ کا رویہ ترقی پسندی اور انقلابیت کا ہے ورنہ میں نے ایسے جاہل اور احمق بھی دیکھے ہیں جو چالیس برس کے ہو کر بھی جاہل اور تاریک دماغ رہتے ہیں۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

---

[1] نبیلہ بی بی نے خون میں ابا جان کی تحریریں پڑھیں اور خط و کتابت شروع کی۔ جب تک لاہور میں رہے ہمارے گھر بھی تشریف لایا کرتیں۔ نہایت پر جوش ترقی پسند خیالات کی مالک تھیں۔

جہلم

۸ ستمبر ۱۹۸۵ء

عزیزم زاہد[1] سلام مسنون

تہاڈے اتوں گھلّے دو پتر ملے نیں۔ مینوں بڑا افسوس اے جے جواب چر کا دے رہا ہاں۔ میری صحت پہلاں نالوں ہُن وَل اے تے میں ایس روگ دا مقابلہ کر دا پیا ہاں۔ مینوں ایس گل دا پتہ اے پئی ایہہ روگ بڑا اوترا اے تے لوکی آکھدے نیں جے جان نال ای جاندا اے پر میں نا امید کیوں ہوواں کیوں جے نا اُمید ہونا میرے مسلک دے خلاف ہے۔

تسی آوناں چاہو تے پہلاں اطلاع کر دینا پئی کدوں تے کس ویلے آؤ سو۔ میں اکتوبر دے اخیر وچ پنڈ ٹُر جاساں۔

آس اے پئی تسی تے تہاڈے سنگی خیری میہری ہوسن۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

۱۔ والدِ گرامی کا ایک معتقد نوجوان۔

جہلم

سید علی عباس جلالپوری

مکان عظمت اللہ چودھری

ایوامحلہ کچہری روڈ

۶ نومبر ۱۹۸۶ء

عزیزہ[1]! سلامت رہو

آپ کا خط ملا۔ آج کل میں اپنے گاؤں جلالپور شریف ضلع جہلم جانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ہفتے تک چلا جاؤں گا۔ میری صحت قدرے بہتر ہے۔ علاج جاری ہے۔ آپ کے لیے مناسب ہو گا کہ روسی اُدباء کی جن کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ پڑھ ڈالیں۔ ان میں پشکن، ترگنیف، آسٹرووسکی، ٹالسٹائے، گورکی اور چیخوف کے آسان ترجمے عام طور سے مل جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ لکھنے کی مشق بھی کرتی رہیں تاکہ تحریر میں صفائی اور روانی آ جائے۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

۱۔ عائشہ نبیلہ

سید علی عباس جلال پوری
مکان چودھری عظمت اللہ
ایوا محلہ کچہری روڈ جہلم
۶ نومبر ۱۹۸۵ء

مشتاق احمد صاحب! اسلام مسنون

آپ کے خطوط مل گئے ہیں۔ میں گاؤں جانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اس لیے وقت پر جواب نہ دے سکا۔ آئندہ مجھے جلال پور شریف کے پتے پر خط لکھیں۔ میں نے آپ کا مختصر سا مضمون غور سے پڑھا ہے۔ آپ نے درست کہا کہ خرد افروزی کے راستے میں مذہب ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن آج کل کے مذہبی جنون کے دور میں کون اس بات کی تاب لا سکے گا۔ میری کتاب ''اقبال کا علمِ کلام'' جس میں خرد افروزی کی دعوت دی گئی تھی، کے خلاف جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس سے آپ شاید واقف نہیں ہیں۔ آج کل تو ایسے مضامین پسند کیے جاتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اسی میں مخفی ہے۔ اہلِ مغرب نے جو ترقی کی ہے وہ قرآن ہی کا فیضان ہے۔ سوشلزم پر خدا کا پیوند لگا دیا جائے تو وہ اسلام بن جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں سے لوگوں کے ذہن پراگندہ کیے جا رہے ہیں اور انہیں برتری کے زعم میں مبتلا کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگ حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے ہیں اس ضمن میں ''اقبال کا علمِ کلام'' کے آخری دو باب پڑھنا ضروری ہیں یہ کتاب آج کل مارکیٹ میں نہیں ملتی آپ کو کسی علم دوست آدمی کے پاس مل جائے گی۔ اس سلسلے کی دوسری کتاب ''عام فکری مغالطے'' کا دوسرا ایڈیشن عنقریب چھپ جائے گا۔

اُمید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔

خیر طلب
علی عباس جلالپوری

جلال پور شریف ضلع جہلم

۳۰ نومبر ۱۹۸۵ء

عزیزہ[ا]! سلامت رہو

آپ کا خط ملا۔ آپ کے پاپا جی کی وفات کی خبر دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو جانا آپ کے لیے ایک بڑی آزمائش ہے۔ تلقینِ صبر کے رسمی الفاظ آپ کے صدمے کو دور نہیں کر سکیں گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی آپ کا صبر اور حوصلہ بحال ہو سکے گا۔ میری طرف سے تمام گھر والوں کے سامنے اظہارِ افسوس کریں۔ میں اور لالہ رُخ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

ا۔ غالباً نبیلہ

جلالپور شریف

۳۰ نومبر ۱۹۸۵ء

مشتاق صاحب!

آپ کا خط مل گیا ہے۔ میری کتاب ''اقبال کا علم کلام'' اب کسی لائبریری سے ہی مل سکے گی۔ میرے ذاتی نسخے بعض لوگوں نے مانگ لیے اور پھر واپس نہیں کیے۔ آپ بھی کسی کالج کی لائبریری سے پتہ کریں۔ ''عام فکری مغالطے'' میرے کچھ عزیز چھاپ رہے ہیں۔ چھپ گئی تو آپ کو بھجوا دوں گا۔ ''روح عصر'' کا دوسرا ایڈیشن مکتبۂ آئینہ ادب۔ المینار مارکیٹ لاہور سے چھپا تھا شاید وہاں سے دستیاب ہو سکے۔ پنجابی کی کتاب ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' پنجاب اکیڈمی والوں نے چھاپی تھی۔ ''مقالات جلالپوری'' بھی آئینۂ ادب سے مل جائے گی اور شاید ''مقامات وارث شاہ'' بھی یہیں سے مل سکے گی۔ باقی تو شاید آپ کی نظروں سے گزری ہوں گی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہم جہالت، ریاکاری اور جنون کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ خرد افروزی کی شمع روشن رکھیں۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

پ۔ن

میرے اور ڈار صاحب کے درمیان جو مباحثہ ہوا تھا اُسے پڑھنے کے لیے دفتر فنون۔ ۴ میکلوڈ روڈ لاہور کو لکھیں کہ اس مباحثے کے پرچے آپ کو بھیج دے۔

ضلع جہلم

سید علی عباس جلالپوری

ڈاک خانہ۔جلالپور شریف

ضلع جہلم

۵جنوری ۱۹۸۶ء

مکرمی قاسمی صاحب!

فنون کا نیا شمارہ مل گیا ہے، شکریہ۔ میں نومبر میں ہی یہاں آ گیا تھا۔ میری صحت قدرے بہتر ہے لیکن داہنے ہاتھ میں رعشہ ہونے کے باعث لکھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ اب ساری علمی سرگرمی پڑھنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ خط میں عزیزہ لالہ رُخ سے لکھوا رہا ہوں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ عزیزہ کا انتخاب پبلک سروس کمیشن نے کر لیا ہے۔ اب وہ تقرری کے احکام کی منتظر ہے۔ اُس کی طرف سے آداب۔

اُمید ہے کہ آپ کے گھر میں ہر طرح سے خیریت ہوگی۔

نیرطلب

علی عباس جلالپوری

میری ملازمت کی ابا جان کو بے حد فکر رہی۔ کہا کرتے تھے، میری موت کے بعد تمہارا کیا بنے گا۔ ان دنوں وہ میری شادی کے لیے بھی فکر مند رہا کرتے تھے۔ میری تقرری ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گورنمنٹ کالج برائے خواتین ہوئی تو اس کی خبر جعفر بھائی جان نے اخبار میں پڑھی۔ تب وہ حویلیاں میں ملازمت کر رہے تھے۔ اخبار لے کر گھر آئے۔ تو والد کی خوشی دیدنی تھی۔ آج بھی ان کا مسرت سے دمکتا چہرہ میری نم آلود آنکھوں میں جگمگا رہا ہے۔

جلالپور شریف

۸جنوری ۱۹۸۶ء

عزیزہ نبیلہ! خوش رہو

آپ کا خط ملا۔ میں نومبر میں یہاں آ گیا تھا۔ میری طبیعت ناساز رہتی ہے۔ اس لیے خطوں کا جواب لکھوانے میں دیر ہو جاتی ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میرا دایاں بازو اور ہاتھ مفلوج ہو چکے ہیں اور میں کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔ آپ جیسے عزیزوں سے جو دلی تعلق ہے اُس سے میرے دل کو تقویت ہوتی ہے۔ ترقی پسندوں، محمد اشرف وغیرہ کی کتابیں پڑھنے سے آپ کے خیالات میں توانائی اور نکھار آ جائے گا۔ سجاد ظہیر اور فیض کی کتابیں بھی آپ نے پڑھی ہوں گی۔ اُمید ہے کہ آپ کے گھر میں ہر طرح سے خیریت ہوگی۔ آپ کے بھائی جان کو میں غائبانہ جانتا ہوں۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

پروفیسر ظفر علی خاں کی وفاِ گرامی سے محبت ہم سب کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ ظفر علی خاں دولتالہ سے ٹرانسفر ہو کر گورنمنٹ کالج جہلم تشریف لائے تو حامد بھائی جان سے گہری دوستی ہو گئی۔ علمی حقائق کی کھوج انہیں جلالپور شریف اباجان کے پاس لے آئی۔ اباجان کا علمی سمندر تھا اور بقول ظفر علی خاں "میں پیاسا تھا۔" تبادلۂ خیال یوں ہوا گویا پانی میں پانی مل گیا۔ اباجان فالج کے موذی مرض کا شکار ہو گئے تو جہلم شفٹ ہونا پڑا۔ ظفر علی خاں کے لیے ہم محسوس کرتے کہ وہ ہمارے گھر کے نہایت اہم فرد ہیں۔ مکتبۂ خرد افروز جہلم قائم ہوا تو اس کے زیرِ اہتمام ظفر علی خاں نے اباجان کے وہ تمام مسودات، جو پبلشرز کی چیرہ دستیوں کا شکار رہتے تھے، طبع زاد کتب میں بدل دیے۔ سرخ رنگ کے ٹائٹل میں ۱۳ کتب منظرِ عام پر آ گئیں۔ اولین ایڈیشن عام فکری مغالطے، رسوم اقوامِ قدیم، جنسیاتی مطالعے، کائنات اور انسان، روایاتِ تمدنِ قدیم، خرد نامہ جلالپوری کے شائع ہوئے جبکہ Reprint ہونے والی کتب میں اقبال کا علمِ کلام، روحِ عصر، روایاتِ فلسفہ، شامل تھیں۔ پروفیسر ظفر علی خاں کا علمی دنیا پر گراں بہا احسان ہے کہ انہوں نے اباجان کی علمی کاوشوں کو نہایت خلوص و محبت سے نظر افروز بنا دیا۔ ظفر علی خاں جب بھی نئی شائع شدہ تالیف

ابا جان کو دکھاتے، ان کے چہرے پر پُرمسرت سُرخی چھا جاتی۔ بائیں ہاتھ میں کتاب لے کر دیکھتے... ظفر علی خاں سے باتیں بھی کرتے جاتے اور کتاب پر پیار سے ہاتھ بھی پھیرتے جاتے... اُن کے لیے کتاب اولاد کی طرح عزیز ہوتی۔ اُن کے دمکتے چہرے کو دیکھ کر ظفر علی خاں کہتے "میری محنت وصول ہو گئی"۔ ظفر علی خاں نے ابا جان کی تحریروں کو پبلشرز کی روباہی سے بچالیا تھا۔ انہیں کے کہنے پر ابا جان نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق بھی شروع کر دی۔ ان کے بائیں ہاتھ سے لکھے میرے نام کے خطوط محفوظ ہیں۔ تحریکِ خرد افروزی پر حکومتی ایوارڈ بے نظیر بھٹو کے دور میں طے ہوا تو ابا جان نے ایوارڈ لینے میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا، اس پر ظفر علی خاں اُن کے سر ہو گئے۔ خوب مباحثے ہوئے آخر ابا جان نے ہتھیار ڈال دیے اور فلسفے کو ایوارڈ دیے جانے پر رضامندی ظاہر کی... ظفر علی خاں کی شخصیت اور ترقی پسند سرگرمیوں میں اُن تھک محنت ایک الگ تحریر کی متقاضی ہے... اس زمانے میں میں ظفر علی خاں کو عام لوگوں سے ماورا سمجھا کرتی تھی بعد میں جوں جوں اُن کا بے لوث کام سامنے آتا گیا، میرے خیال کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔

جلالپور شریف
ضلع جہلم
۸ جنوری ۱۹۸۶ء

عزیزم ظفر خاں! دعائے سلامتی

عزیز حامد رضا کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ سے کوئی حادثہ ہوا ہے اور گھٹنے پر سخت چوٹ آئی ہے۔ یہ پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ آپ جیسے سیلانی جہاں گرد کا گھٹنا زخمی ہو جانا اتنا ہی افسوسناک ہے جتنا کہ میرے جیسے عادی لکھاری کا ہاتھ لکھنے سے معذور ہو جانا۔

ہم سب کی دعا ہے کہ آپ کو جلدی صحت نصیب ہو اور بستر کی قید سے رہائی ہو۔ لالہ رُخ کی کامیابی کی مبارک باد کا شکریہ۔

برادرم شعبان خاں اور عزیزہ قمر النساء بیگم کو سلام مسنون۔ بچوں کو پیار۔ لالہ رُخ کی طرف سے سب کو آداب۔

فقیر
علی عباس

ظفر علی خاں جہلم کالج میں حامد بھائی کے دوست رہے۔ انگلش کے پروفیسر تھے۔ بعد ازاں دیال سنگھ کالج میں ٹرانسفر ہو گئے۔ ترقی پسند اور روشن خیال انسان ہیں۔

(۲۳) جلالپور شریف

۱۱ فروری ۱۹۸۶ء

محترمی آغا صاحب! سلام مسنون

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ براہ کرم "تاریخ کا نیا موڑ" کے پانچ بقیہ نسخے بھی بھجوا دیں۔

آپ نے میرے مضامین واپس کر دیئے تھے۔ آپ کی مرضی۔ میں خود انھیں چھپوا لوں گا۔ آپ کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا کیوں کہ یہ مضامین عام طور سے پسند کیے گئے تھے۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

یہ آغا صاحب "کلاسیک" والے ہیں۔ پورا نام "آغا امیر حسن"

جلالپور شریف

۱۱ فروری ۱۹۸۶ء

مشتاق احمد صاحب! اسلام مسنون

آپ کے خطوط ملے۔ اُمید ہے کہ آپ نے میری بھیجی ہوئی کتاب پڑھ لی ہوگی۔ افسوس کہ اس ایڈیشن میں کافی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ایک غلطی خاص طور سے درست کر لیں۔ صفحہ ۴۸ سطر ۵ میں "الفاظ" غلط لکھا گیا ہے "دشتِ سوس" محض ایک ناول ہے جس میں واقعات کی تحقیق نہیں کی گئی اور محض خیال آرائی سے کام نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حسین بن منصور حلاج کی "کتاب الطواسین" کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے اور عام طور سے دستیاب ہے۔"

ویسے اس کی زندگی کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میرے پاس لوگوں کے خطوط پڑے رہتے ہیں لیکن داہنے ہاتھ میں رعشہ کے باعث میں باقاعدگی سے جواب نہیں لکھ سکتا اس لیے جواب میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ فنون کے جن پرچوں میں میرے اور بشیر ڈار مرحوم کے مابین مباحثہ ہوا تھا وہ دفتر فنون ہی سے مل سکیں گے۔ میرے پاس وہ پرچے تھے لیکن ایک صاحب اُٹھا کر لے گئے اور واپس کرنے کی زحمت نہیں کی۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

جلالپور شریف، ضلع جہلم

۱۲فروری ۱۹۸۶ء

عزیزہ نبیلہ! دعائے سلامتی

افسوس ہے کہ علالت کے باعث میں آپ کے سوالوں کا مفصل جواب نہیں دے سکا کیوں کہ میرے لیے بستر پر سے اُٹھنا اور الماریوں سے کتابیں تلاش کرنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔

۱۔ میں سٹالن کا کچھ زیادہ مداح نہیں ہوں۔ سٹالن نے لینن کی بیوی ''مز پسن کایا'' کی توہین کی تھی۔ لینن کے مرتے وقت جو وصیت لکھی تھی اس میں لکھا تھا کہ سٹالن اکھڑ اور درشت خو آدمی ہے جو اپنے خیالات سے اختلافات کرنے والوں سے انتقام لینے پر کمر بستہ رہتا ہے۔

بعد میں سٹالن نے لینن کے اس تجزیے کو سچ کر دکھایا اور گورکی ہی نہیں کئی دوسرے اکابر پر بھی سخت تشدد کیا۔

۲۔ گاندھی ایک کٹر ہندو اور رجعت پسند تھا۔ اس کا دماغ بھی پراگندہ تھا وہ انگریزوں سے ٹکر لینا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں پریشان کر کے ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ سبھاش چندر بوس اور چندر شیکھر آزاد جیسے مخلص لوگ گاندھی کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

۳۔ غدر پارٹی میں جس کا آغاز امریکہ سے ہوا تھا، سچے کمیونسٹ اور انقلابی شامل تھے۔ انگریزوں کے ایجنٹوں کی غداری سے غدر پارٹی کے افراد اپنے عزائم کی تکمیل نہ کر سکے۔ وہ ہندوستان پہنچے تو کئی قتل ہوئے۔ اکثر کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیئے گئے۔

۴۔ پنڈت نہرو نہ کمیونسٹ تھا نہ سوشلسٹ۔ اُس نے دکھاوے کے لیے سوشلزم کا لبادہ اُوڑھ رکھا تھا۔ حقیقت میں وہ نہایت متعصب ہندو تھا اور گاندھی کا چیلا تھا۔

لالہ رخ اپنی بہن کے پاس پنڈی جا رہی ہے۔ اب میں تمہارے خط کا جواب بھی نہیں دے سکوں گا کیوں کہ میرا داہنا ہاتھ بیکار ہے۔

خیر طلب

علی عباس جلالپوری

(۲۶) جلالپور شریف
ضلع جہلم
۲۰ فروری ۱۹۸۶ء

کاظم صاحب[1] دعائے سلامتی

آپ کا خط ملا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ میں عدم آباد پہنچ گیا ہوں اور ڈاکیا فرشتہ اس جہاں آب وگل سے میرا خط لے کر آیا ہے۔ میں اپنی علالت کے بارے میں نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ کسی سے اس کا تفصیل سے ذکر کرتا ہوں۔ زندگی کے اس آخری مرحلے میں بس یہی خیال بار بار آتا ہے کہ چپکے سے آغوشِ قبر میں لڑھک جاؤں کیوں کہ بقول ابوذر غفاری،

"زمین کی پیٹھ سے مجھے اس کا شکم زیادہ عزیز ہے۔"

مجھے کسی سے کچھ گلہ نہیں ہے نہ عزیزوں سے نہ دوستوں سے۔

میں نے ایک مدت سے اپنے آپ کو بڑھاپے اور امراض کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ اب تو مجھے ہوا کے اس جھونکے سے بھی شکایت نہیں ہے جو میری زندگی کے چراغ کو گل کر دے گا۔ جدید دور کے ایک شاعر نے کہا ہے:

ہوا کے سامنے رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

اس شعر میں میں نے تھوڑا سا تصرف کیا ہے۔

اپنی اس بیماری کے دوران مجھے فلسفہ بہت کام آیا ہے۔ اس نے مجھے اس قابل کر دیا ہے کہ میں ایک تکلیف دہ اور ناگوار صورتحال کے ساتھ مفاہمت کر سکوں۔

کبھی کبھی جاڑے کی لمبی راتوں کو جاگ کھل جاتی ہے اور پھر پہروں جاگتا پڑا رہتا ہوں۔ ایسے میں گزشتہ زندگی کے حالات فلم کے مناظر بن کر آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگتے ہیں۔ اسی عالم میں ایک غزل ہو گئی جس کے چند اشعار آپ کی تفریح طبع کے لیے درج ذیل ہیں۔

کیسی کیسی روشن شمعیں آنکھوں کی بے نور ہوئیں
کیسے کیسے چاند سے چہرے گہنائے غم ناک ہوئے

---

[1] سید محمد کاظم

کیسے کیسے سندر سپنے راہِ طلب کی دھول ہوئے
کیسے کیسے ارمان دل کے خاک میں مل کر خاک ہوئے
لوگ حریم ناز میں سید شمع وصال جلاتے ہیں
ہم تو اپنے ہی شعلوں کے آپ خس و خاشاک ہوئے

ایک دن ظہیر کاشمیری کی ایک غزل اسی زمین میں ٹیلیوژن پر سنی تھی میں نے بھی چند شعر موزوں کر دیئے۔ میرے داہنے ہاتھ میں رعشہ ہے اس لیے لکھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو اپنی بیٹی سے خط املا کرا لیتا ہوں لیکن علمی مضمون اس طرح املا نہیں کرائے جا سکتے۔ بہت کچھ لکھا اب مزید لکھنے کی ہوس نہیں رہی۔ آٹھ کتابیں چھپ گئی ہیں۔ چھ کتابوں کے مسودات پڑے ہیں۔ اُن کے چھاپنے کا پروگرام ہے۔ میری آخری کتاب "تاریخ کا نیا موڑ" پچھلے سال چھپی تھی۔ شاید آپ تک پہنچ گئی ہو۔ ایک اور کتاب، "عام فکری مغالطے" کا نیا ایڈیشن بھی چھپ گیا ہے جو میرے بیٹوں نے چھپوایا ہے۔ اس کے بعد ایک اور کتاب آ رہی ہے۔ اُمید ہے کہ میرے زیرِ زمین جانے سے پہلے دوسری کتابیں بھی چھپ جائیں گی۔ "اقبال کا علم کلام" کی کتابت قاسمی صاحب دابے بیٹھے ہیں۔ انہیں کئی خط لکھ چکا ہوں لیکن ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ میں بظاہر آپ کے سفرنامے کا مقدمہ نہیں لکھ سکوں گا۔ اگرچہ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ میں اس کے حوالے سے جرمنی کے فکری اور ذوقی دین کا جائزہ لوں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کے بیٹے کا نکاح حسنات صاحب[1] کی نواسی سے ہو گیا ہے۔ خدا مبارک کرے۔

امجد حسین کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے مگر خدا معلوم کیوں لکھنے سے گھبراتے ہیں۔

میں شاید مارچ کے آخر میں جہلم چلا جاؤں۔

مخلص

علی عباس جلالپوری

1۔ حسنات صاحب ابا جان کے کزن بھی تھے اور نہایت مخلص دوست بھی۔ ایف۔ اے میں حسنات صاحب نے ابا جان سے انگریزی بھی پڑھی تھی۔ گوجرانوالہ میں ڈی۔ سی بھی رہے۔ لاہور تبادلہ کروانے میں حسنات صاحب نے ابا جان کی بہت مدد کی تھی۔ ابا جان نے اپنی کتاب حسنات صاحب کے نام کی۔ حسنات صاحب کتاب الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر مسکرا کر بولے: "مجھے تو بس اپنا نام ہی سمجھ میں آیا ہے۔"

سید علی عباس جلالپوری

ایو محلہ، کچہری روڈ

جہلم

۱۴ جون ۱۹۸۶ء

مکرمی قاسمی صاحب! اسلام مسنون

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط کا جواب کچھ تاخیر سے دے رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ جو حالات آپ نے بیان کیے ہیں وہ میرے علم میں نہیں تھے۔ دوسری یہ کہ آج سے دو سال پہلے مکتوبہ بھیجنے کا آپ نے پکا وعدہ کیا تھا اور ایک دفعہ تو یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کسی دن خود اسے لیتے آئیں گے۔ میں انتظار میں بیٹھا رہا لیکن آپ مکتوبہ نہ بھیج سکے۔ اسی بات کی شکایت میں نے کاظم صاحب سے کی تھی جو آپ کی خفگی کا باعث ہوئی۔ بات یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے یہ مکتوبہ مل جاتا تو اب تک کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ چکا ہوتا۔ اب مجھے پھر نئے سرے سے تگ و دو کرنا پڑے گا۔

فقیر

علی عباس جلالپوری

جہلم

۱۵ جون ۱۹۸۶ء

عزیزم مظفر خان!

عمر دراز با مراد

آپ کے دونوں خط پہنچ گئے ہیں۔ اُن سے آپ کی خیریت کی خبر ملی اور دلی اطمینان نصیب ہوا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں ان خطوط کا جواب بڑی دیر سے لکھوا رہا ہوں لیکن اس تاخیر کی وجہ بھی معقول تھی۔ کچھ عرصہ سے میرے داہنے پاؤں میں درد رہتا ہے۔ جس سے میری طبیعت بڑی پریشان رہتی ہے۔ میں نے اس موذی مرض کا مقابلہ ہمت اور استقلال سے کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آپ جانتے ہیں یہ مرض بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ خیر جو خدا کو منظور ہوا وہی بہتر ہوگا۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ عنقریب وطن آ رہے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دیں۔ بات یہ ہے کہ اب کسٹم کے قواعد کچھ سخت ہو گئے ہیں اس لیے باہر کی چیزیں بہت مہنگی آتی ہیں اور مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں ہے جو یہاں سے نہ مل سکتی ہو۔ آپ کو مبارک ہو کہ فرحت بیگم جہلم کے ہائی سکول میں بورڈنگ کی مس وارڈن لگ گئی ہے۔ تنخواہ معقول ہوگی۔ کھانا اور رہائش مفت ہے۔ بورڈنگ کا انتظام اس کے سپرد ہے۔ میری بیگم اور لالہ رخ اُسے ملنے جاتی رہتی ہیں۔ وہ بھی کبھی کبھار آ جاتی ہے۔ لالہ رخ گرمیوں کی چھٹیوں میں آئی ہوئی ہے۔ اس سے یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہوگا کہ عزیز علی رضا کا بھائی عالمِ وجود میں آیا ہے۔ ماشاء اللہ اس کی صحت اچھی ہے۔ حامد رضا، جعفر رضا، لالہ رخ۔ اُن کی والدہ اور نغمانہ کی طرف سے سلام مسنون۔

دعاؤں کے ساتھ

علی عباس جلالپوری

۱۔ راجہ مظفر خان، راجہ لال خان کے اکلوتے صاحب زادے ہیں۔ فرحت راجہ ان کی سب سے چھوٹی ہمشیرہ ہیں۔ شادی کے بعد لندن میں مقیم ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری

معرفت

پروفیسر سید حامد رضا

ایوا محلہ کچہری روڈ جہلم

۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء

مکرمی قاسمی صاحب! سلام مسنون

''فنون'' کا نیا شمارہ مل گیا ہے شکریہ۔ میں ابھی سرسری نظر ہی سے اسے دیکھ سکا ہوں۔ مجھے اس کا علمی حصہ بظاہر معیاری معلوم ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ پڑھوں گا تا کہ اس کے مطالعے میں زیادہ سے زیادہ دن گزار سکوں۔ سید محمد کاظم صاحب کا خط پڑھ کر میں بڑا محظوظ ہوا۔ انہوں نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے کے ساتھ تعریف و تحسین کا چارہ لگا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ایک آدھ مچھلی اُسے نگل جائے گی اور اُن کے شالا مار میں چہل قدمی کرنے کا کوئی نہ کوئی عنوان بن جائے گا۔ میری طرف سے انھیں سلام پہنچے۔

نیاز مند

علی عباس جلالپوری

سیدعلی عباس جلالپوری
ایوامحلہ کچہری روڈ جہلم
۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء

مکرمی محمد منیر بھٹی صاحب! اسلام مسنون

آپ کا عنایت نامہ مل کر کاشفِ حالات ہوا۔ یہ معلوم کر کے دُکھ ہوا کہ آپ بھی میری طرح ایک موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ خدا رحم کرے۔ میں دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا فالج میں مبتلا رہا۔ خدا کی مہربانی سے مجھے بچے سعادت مند ملے ہیں۔ اُن کی شبانہ روز خدمت نے مجھے چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ اب چھڑی کے سہارے گھر کے اندر تھوڑا بہت چل لیتا ہوں۔ اس مرض سے دماغ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور کسی علمی مسئلے پر غور کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال ہلکی پھلکی چیزیں پڑھ لیتا ہوں۔ فلسفے کے مطالعے نے مجھے اپنی قسمت پر شاکر ہونا سکھا دیا ہے۔ کبھی کبھار افسردگی کا شدید احساس ہوتا ہے لیکن پھر طبیعت خود بخود سنبھل جاتی ہے۔ اسی دھوپ چھاؤں میں زندگی گزر رہی ہے۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا تھا

کبھی حیرت کبھی مستی کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

میری دعا ہے کہ آپ کا سایہ برسوں تک اپنے بچوں پر قائم رہے۔ مجھے بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے کہ زندگی کے بقیہ دن سکون سے گزر جائیں۔ ہم سب کی طرف سے آپ سب کو پُر خلوص سلام، دعا، پیار۔

نیاز مند
علی عباس جلالپوری

لاہور میں ہمارے مالک مکان جناب منیر بھٹی صاحب کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ مرحوم نہایت با اخلاق انسان تھے۔

ایوا محلہ کچہری روڈ
جہلم
۵ جولائی ۱۹۸۶ء

مکرمی آغا صاحب! اسلام مسنون

بات یہ ہے کہ جس انداز میں آپ نے میرے مضامین کا مجموعہ واپس کر دیا تھا اس سے میری عزتِ نفس کی جراحت ہوئی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اپنی کتابیں خود ہی چھاپوں گا کیوں کہ اللہ کے کرم سے میرے پاس بھی وسائل کی کمی نہیں ہے۔
اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر اندیش
علی عباس جلالپوری

آغا امیر حسین صاحب نے "تاریخ کا نیا موڑ" کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت چاہی اور لگاتار کئی خطوط تحریر کیے تو ابا جان نے مجھ سے یہ خط لکھوایا۔

ایوامحلہ کچہری روڈ
جہلم
۹۲-۲-۴

عزیز القدر! سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ آپ نے میری کتابوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میرے لیے تقویتِ قلب کا باعث ہے۔ میں بڑھاپے کی منزل میں ہوں۔ گوناں گوں امراض کا غلبہ ہے۔ میرا داہنا ہاتھ رعشے سے بیکار ہو گیا ہے اس لیے خطوط کا جواب دینے سے قاصر ہوں جب کوئی لکھنے والا مل گیا تو خطوں کا جواب املا کرا دیتا ہوں۔ یہاں میں اپنے بڑے بیٹے کے ہاں مقیم ہوں اور اکتوبر میں اپنے وطن جلالپور شریف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ ہمہ وجوہ خیر و عافیت سے ہوں گے۔
آپ کی نیک تمناؤں کا مستحق

فقیر
علی عباس جلالپوری

درج بالا خط کلیم خارجی کے خط کے جواب میں، میں نے ہی تحریر کیا تھا۔ یہ صاحب سالار منڈی رسال پور کینٹ، نوشہرہ (N.W.F.P) میں مقیم تھے۔

سید علی عباس جلالپوری معرفت

پروفیسر سید حامد رضا

ایوا محلہ، کچہری روڈ، جہلم

۲۷ جولائی ۱۹۸۶ء

عزیزہ نبیلہ! سلامت رہو، خوش رہو

تمہارے خط غالباً گاؤں کے پتے پر لکھے گئے تھے اور میں کئی ماہ سے یہاں مقیم ہوں۔ اس لیے میں تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دے سکا۔ تمہارا خط دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ تم اپنے دُکھ پر ابھی تک قابو نہیں پا سکیں۔ قدرت نے چھوٹی سی عمر میں کیسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ہمت کرو۔ اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کرو۔ ابھی تمہارے سامنے زندگی کی طویل راہیں پڑی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن دلی خوشی سے ہم کنار ہوگی۔ بس رویا نہ کرو اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دن میں دو چار بار مسکرا لیا کرو اس سے طبیعت سنبھل جائے گی۔ دنیا حادثات کا گھر ہے۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہنے کا تاوان دینا ہی پڑتا ہے۔

مجھے دیکھو۔ فالج جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوں۔ چلنے پھرنے سے قریب قریب معذور ہو چکا ہوں پھر بھی کسی نہ کسی کتاب کے چھپوانے کی فکر میں رہتا ہوں تاکہ اپنے مشن کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ تم بھی دلیری سے کام لو۔ ہار مان لینا ہمارے مسلک کا شیوہ نہیں ہے۔ شاباش اگلے خط میں مجھے بتانا کہ تم نے ازسرِ نو ہمت اور استقلال کی کمر باندھ لی ہے۔

دعا گو

علی عباس جلالپوری

جون ۱۹۹۳ء میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین لالہ موسیٰ سے تبادلہ کروا کر آئی تھی۔ لالہ موسیٰ میں لاہور کالج برائے خواتین سے فزکس کی پروفیسر مس ساجدہ مرزا بطور پرنسپل آ گئیں۔ نہایت وضع دار، دین دار اور شریف النفس خاتون تھیں۔ تقریباً ایک سال گزارنے کے بعد وہ واپس لاہور تبادلہ کروانے میں کامیاب ہو گئیں اور مجھے گوجرانوالہ ٹرانسفر کا مشورہ دیا۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن کالج میں اُن کی چھوٹی ہمشیرہ مس زاہدہ سلطانہ مرزا پرنسپل تھیں۔ چنانچہ انہوں نے میرا تبادلہ اس ادارے میں کروالیا اور پھر میرا بہت خیال رکھا۔ میں ان دونوں بہنوں کو اپنا مربی اور محسن خیال کرتی ہوں۔

2008ء میں ایک صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ کالج میں مصروفیات کے باوجود میں ان صاحب کو ملنے گئی تو تو انہوں نے نہایت شائستگی سے اپنا نام بتایا۔ وہ گورنمنٹ ہائی سکول ڈسٹرکٹ کلاسکے گوجرانوالہ کے سینئر ہیڈ ماسٹر تھے ان کا اسم گرامی محمد اسلم چیمہ تھا۔ اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ پروفیسر سید علی عباس جلالپوری کی صاحب زادی ہیں تو میں سلام کرنے چلا آیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے درج ذیل تحریر مجھے دی جو کہ انہوں نے اپنے استاد گرامی کے لیے مرتب کی تھی۔ انہیں فخر تھا کہ وہ سید صاحب کے طالب علم ہیں۔ اُن کا ایک خط یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

کیلا سکے ضلع گوجرانوالہ

۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء

محترمہ پروفیسر لالہ رُخ بخاری صاحبہ!

سلام عقیدت

حال ہی میں کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ پروفیسر علی عباس جلالپوری کی صاحب زادی گورنمنٹ کالج برائے خواتین سیٹلائیٹ ٹاؤن کالج میں بطور اردو کی پروفیسر تعینات ہیں تو استاد گرامی کی محبت جو ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ رہی، سینے میں جوش مارنے لگی۔ آپ سے ملاقات کا مقصد بھی یہی تھا کہ اپنے استاد محترم قابل صد احترام رہنما جناب سید علی عباس جلالپوری کے بارے میں آپ کو اپنے احساسات میں شریک کروں جو ایک حقیقت پسند، لازوال شخصیت اور عظیم فلسفی تھے۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بی۔ایڈ میں داخلہ ہوا۔ اگست ۱۹۷۱ء میں کورس کی تکمیل ہوئی۔ سید صاحب سے شرف تلمذ ہوا۔ طریقہ تدریس نہایت موثر اور دلنشیں تھا۔ میرے پسندیدہ استاد تھے۔ فارغ وقت میں اُن کے ساتھ بھرپور گفتگو ہوئی۔ اگرچہ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ایک دن لاہور گیا۔ مکتبۂ دانش میں اُن کی کتب دیکھیں اُن کی یاد نے ستایا اور چند کتابیں خرید لیں۔ مقامات وارث شاہ، رسوم اقوام اقبال کا علم کلام وغیرہ۔ روح عصر اُن کی مایہ ناز اور لافانی کتاب ہے۔ ایک روز دوران لیکچر انھوں نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں ایک ایسی شخصیت ہے کہ جو بات ہم ایک صفحہ میں لکھتے ہیں وہ ایک سطر میں بیان کر دیتے ہیں[1]۔ حیران تھا کہ آپ نے تو اس تقریر کو پارہ پارہ کر دیا تھا جو صدر پاکستان یحیٰی خان نے ریڈیو پاکستان پر نشر کرنا تھی۔ اقبال کے ناقدوں میں آپ کا شمار ہے۔ اقبال کو شاعر تصور کرتے ہیں۔ ایک بڑا شاعر لیکن فلسفی نہیں مانتے۔ معلوم نہیں وہ کون سی شخصیت ہے۔ میں نے پوچھا تو فرمایا، ”وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں“۔ اس سے قبل میں مولانا صاحب کو نہیں جانتا تھا۔ بعد میں ہم نے اچھرہ میں اُن کی سوال و جواب کی محفل میں بھی شرکت کی۔ بلاشبہ مولانا بین الاقوامی سطح کے مذہبی عالم ہیں۔

ا۔ مذہبی لوگ دلائل و براہین سے کام نہیں لیتے جبکہ فلسفی اپنی بات ثابت کرنے کے لیے تفصیلی گفتگو کا قائل ہوتا ہے۔ والد گرامی نے یہ بات طنزیہ کہی ہوگی۔

سید صاحب ایک فلسفی، نقاد، ماہرِ تعلیم، دانشور، بے مثل نثر نگار تھے کہ بے شمار صفات ربِ عظیم نے انہیں عطا کی تھیں۔ اُن کی شخصیت پہلودار تھی۔ عقلیت پسند تھے۔ طوطے مینا کی کہانیاں نہیں مانتے تھے۔ ہر شخص کی بات بڑے غور سے سنتے تھے لیکن بات کو مانتے اپنی مرضی سے تھے۔ بات کرنے والا خود رخصت ہوتا آپ پہل نہیں فرماتے تھے۔ متحمل مزاج تھے۔ رواداری اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ جیسے لوگ نایاب ہیں۔ آج کل مختصر بات کرنے کا وقت ہے اور دوسرے کو برداشت نہ کرنا فیشن بن گیا ہے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں اور بڑے محلات میں رہنے والے لوگ اصل میں چھوٹے لوگ ہیں اور چھوٹے مکانوں کے مکین بڑے آدمی ہیں۔ قیمتی کاریں خریدنے والے اور کروفر کی زندگی گزارنے والے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ بڑے لوگ وسیع القلب، خلقِ خدا کے لیے رحمت ہوتے ہیں۔

پروفیسر جلالپوری صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اُن کی ریٹائرمنٹ پر سنٹرل ٹریننگ کالج کے ہال میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ ہال کو بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ رات سہانی تھی اور سماں دل آویز تھا۔ ایسے لگا جیسے پرستان میں کوئی پریوں کی محفل تھی۔ پورے ملک کے بڑے بڑے شعرائے کرام شامل تھے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، کشور ناہید، طفیل ہوشیار پوری، قیوم نظر، عارف عبدالمتین، احسان دانش کے علاوہ اور بھی شعراء اور ادبا موجود تھے۔ راقم شیشے کے جگ اور گلاس تھامے ہال میں ساقی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بعض شعراء شاعر خواتین سے طنز و مزاح بھی کر رہے تھے۔

جناب جلالپوری صاحب سوٹ میں ملبوس جناح کیپ پہنے دولہا کی مانند سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ رات بھیگ چلی، ستارہ سحر نمودار ہوا اور مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہ ہماری اپنے استادِ محترم سے آخری ملاقات تھی۔

جلالپوری صاحب نابغہ روزگار اور جاذبِ نگاہ شخصیت تھے۔ بڑے کھرے اور منہ پر بات کرنے والے خواہ کسی کو بری لگے۔ چکنی چپڑی باتوں سے وہ قطعاً ناواقف تھے۔ درویش صفت تھے، نہ تصنع نہ بناوٹ وہ مغرب کی چھتر چھاؤں سے دور تھے۔

جلال پور شریف کا قصبہ ضلع جہلم میں راقم نے بارہا دیکھا ہے۔ یہ دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ دیہاتی زندگی کا ایک انمول تحفہ جس کی فضاؤں نے آپ کے ذہن کو معطر رکھا۔ محبت کی فضاؤں میں رہنے والے نے محبتیں بکھیریں۔ فرمایا کرتے کہ آدمی کی محبت عام مکھی کی سی ہے وہ اپنے کوٹ میں گلاب یا کوئی خوش نما پھول اُڑس لیتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اور خوبصورت پھول

دیکھتا ہے تو پہلا پھینک کر اس کے پیچھے چل دیتا ہے۔ علی ہذا القیاس وہ ایک جگہ مطمئن نہیں ہوتا لیکن عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت شہد کی مکھی کی طرح ہوتی ہے۔

میں نے سید صاحب کی اس بات کو معاشرے میں ہر کہیں کارفرما دیکھا ہے۔ چھوٹی سی مثال سے ایک بڑی حقیقت کی نشان دہی کرنا شاہ صاحب ہی کا شیوہ تھا۔ یہی ایک فلسفی کا کمال ہے۔ دانش ور مستقبل سے آگاہ کرتا ہے۔ دلیل سے بات کرتا ہے۔ اس کی تحریروں کو جھٹلانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ کور دماغ نہ سمجھ سکے تو اور بات ہے۔

استاذِ محترم اب اس دنیا میں نہیں مگر اُن کی تحریریں انھیں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھیں گی۔ جس طرح فیض احمد فیض کی شاعری روایت سے ہٹ کر ہے اور انھیں ملامتی صوفی سمجھا جا رہا ہے۔ جلالپوری صاحب کی تحریریں دوسرے اُدباء کو چبھتی تھیں۔ اب اُن سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ محقق حضرات Foot Note دینے سے گھبراتے تھے۔ اب آپ کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں اور رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ حقیقت اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ اُن کی سوچ زاویاتی ہے، یہی سوچ اُن کے تلامذہ میں پائی جاتی ہے۔ اُن کی زندگی بشری کمزوریوں کے باوجود بڑی بے داغ تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ مدارج سے نوازے۔ آمین۔

احقر

محمد اسلم چیمہ

ساکن کیلا سکے گوجرانوالہ

سیّد علی عبّاس جلالپوری۔۔ میرے استاد

فرحت راجہ

لندن، ۲۔ اگست ۲۰۱۲ء

چچا جان! آپ کی یاد شمعِ فروزاں کی طرح ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہے۔ زندگی میں کتنی اذیتیں جھیلیں، کتنی خوشیاں سمیٹیں، کتنی الجھنوں کا سامنا کیا۔۔ ہر مرحلے پر آپ کی دی ہوئی دانش قندیل کی طرح رہنمائی دیتی رہی۔۔۔ شام کو لالہ رُخ سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ ''مکاتیب علی عباس جلالپوری'' ترتیب دے رہی ہوں۔ اگر ابا جان کے تمہارے نام خطوط ہیں تو مجھے بھجوا دو تاکہ شاملِ اشاعت ہو جائیں۔''

میں نے بتایا کہ میں گزشتہ بیس برس سے لندن میں مقیم ہوں۔ ان کے نامے گاؤں میں سنبھال آئی تھی۔ معلوم نہیں محفوظ بھی ہوں گے یا نہیں۔ کہنے لگی: ''اگر خطوط نہیں تو ان کی یادیں قلم بند کر کے E mail کر دو۔'' میں نے حامی تو بھرلی، مگر اب کاموں سے فراغت پا کر لکھنے بیٹھی ہوں تو یادوں کا ہجوم اُمڈ آیا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ کہاں سے شروع کروں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں اور لبوں پر مسکراہٹ۔۔۔ انگلیوں میں لرزش ہے پھر بھی لکھتی جا رہی ہوں۔

چچا جان! آپ جیسی منفرد، مشفق، روادار، بے نیاز، عالم، انصاف پسند، صابر، متحمل مزاج، راست باز ہستی میں نے کہیں نہیں پائی۔۔ آپ نے مجھے جینا سکھایا، مسائل کے بھنور سے نکلنا سکھایا، سربلند رکھ کر جینا سکھایا۔ آپ میرے استاد تھے اور آج بھی ہیں۔۔ ٹھہریے۔۔ یادوں کے سلسلے کو وہاں سے شروع کرتی ہوں جب میں پہلی بار آپ کے ہاں ایف۔ اے کی انگریزی پڑھنے آئی تھی۔ یہ واقعہ ۱۹۷۹ء کا ہے۔۔ دراز قد، سفید رنگت، غلافی آنکھیں، آنکھوں میں لازوال سنجیدگی اور مکمل جانچ کر لینے کی کیفیت بے حد مرعوب کن تھی۔ سفید لان کا کُرتا اور سفید لٹھے کا پاجامہ زیبِ تن کیے، بے حد پُرکشش وجود، سر پر بال کم، کنپٹیوں پر سفید بالوں کا تقدس حسن بخش تھا۔ اس وقت مجھے آپ پر ذوالفقار علی بھٹو کا گمان بھی

ہوا۔ سچی بات ہے میں قدرے خوف زدہ بھی تھی، مگر پڑھانے کا انداز اتنا مشفقانہ تھا کہ دل میں احترام نے مستقل ڈیرا ڈال لیا۔

میں جلالپوری صاحب کے چاہنے والوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ ان کی شخصیت، اُن کا طرزِ گفتگو، اُن کے اطوار، کھانے پینے میں احتیاط، روزانہ پہاڑ پر سیر کی پابندی، دل موہ لینے والی مسکراہٹ کسی حال میں بھی پریشان نہ ہونے کی عادت، دوسروں کی اغلاط سے درگزر کرنے کی عادت مگر پھر بھی محتاط رہنے کا انداز اپنا جداگانہ تھا کہ اُن کے بعد کوئی اور شخصیت نظروں میں جچ ہی نہ سکتی تھی۔

جھوٹ، چوری، لالچ اور خود غرضی کو وہ جرائم قرار دیتے تھے اور مجھے ان برائیوں سے دور رہنے کا سبق دیتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اُن کی عنایت کردہ تعلیم و تربیت سے نہ صرف خود مستفیض ہوئی بلکہ اپنے تینوں بچوں طاہر، آمنہ اور اکبر کی پرورش میں بھی یہی اصول مدِنظر رکھے۔ اپنے دوستوں کو بھی انہی خطوط پر چلنے کے لیے اصرار کرتی رہی۔ میں نے ہمیشہ اپنے عظیم استاد کی دی ہوئی عقل و دانش کو اپنے لیے چراغِ ہدایت بنائے رکھا۔

ضبط و برداشت تو اتنا تھا کہ مجھے اس کی آج تک مثال نہ مل سکی۔ مجھے ان کے پاس جاتے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک غیر معمولی واقعہ ہوا۔ میں ان کے پاس کرسی پر جا بیٹھی اور اپنا ہوم ورک دکھانے لگی، جو وہ روزانہ دیا کرتے تھے۔ مگر آج وہ بالکل خاموش تھے۔ چہرے پر سکوت۔۔ ہونٹ بھینچے ہوئے جیسے کھینچی ہوں۔۔ میں سمجھ نہ پائی کہ کوئی گھمبیر مسئلہ ہے۔ ابھی میں کچھ دریافت کرنا ہی چاہ رہی تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی علی اصغر اندر آئے اور غصیلے انداز میں بولے "بھائی صاحب! اس کی تمام کتابیں باہر نہ پھینکوا دوں۔۔ آپ کی جان پر بنی ہے اور اسے پڑھنے کی پڑی ہے۔" میں خوف زدہ ہوگئی۔ چچا جان نے کہا "یہ ہمارے تعلق والوں کی بیٹی ہے۔ اس کو کچھ نہ کہنا" بعد میں علم ہوا کہ چچا جان گردے کی شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ گرم پتھر تولیے میں لپیٹ کر کمر کی ٹکور کر رہے تھے۔ تمام اہلِ خانہ جیسے ایک سہم میں گرفتار تھے۔ چچا جان نے مجھے دوسرے دن آنے کے لیے کہا۔ میں جیسے کسی طلسم میں گرفتار تھی۔۔ اتنی برداشت۔۔ ہمارے ہاں تو سر درد بھی کسی کو ہوتا تو گھر بھر میں کہرام برپا ہو جاتا۔ "چائے لاؤ۔۔ دباؤ۔۔ گولی دو۔۔ اُف، ہائے۔۔"

کچھ عرصہ بعد ان کی صاحبزادی لالہ رُخ نے مجھے اپنے ہاں سکونت اختیار کرنے کے لیے کہا تو میں ان کے ہاں منتقل ہوگئی۔۔۔ مجھے کبھی احساس نہ ہوا کہ اپنے گھر میں نہیں ہوں۔ اُن کی زوجہ شہزادی بیگم، حامد بھائی جان، گل شگفتہ باجی، جعفر بھائی اور میری عزیز از جان بہن، دوست لالہ رُخ سب مجھے

اپنے اہلِ خانہ میں شامل سمجھتے تھے۔ ہائے وہ سچا اور مخلصانہ پیار جس کی روشنی آج بھی زندگی کے گزرے لمحوں میں سہارا دیتی ہے۔ ماں جی (شہزادی بیگم) تو جیسے مجھے اپنی بیٹیوں پر بھی ترجیح دیتی تھیں۔ حامد بھائی مجھے ماں جی کی تیلیلی کہتے تھے۔ سب حیران تھے کہ فری (فرحت رابعہ) نے ہماری ماں پر کیا جادو کر دیا ہے۔

موسمِ سرما کا جلالپور شریف میں عجب مزا تھا۔ گھر میں خشک فروٹ آتا تو چچا جان چلغوزوں وغیرہ کی میز پر ڈھیریاں بنا دیتے اور سب کو اپنا اپنا حصہ اٹھانے کو کہتے۔ ماں جی مجھے کہتیں تم سب سے چھوٹی ہو پہلے تم اپنا حصہ اٹھا لو۔ سب بہن بھائی مجھے گھورتے کہ یہ بڑا حصہ اٹھائے گی۔۔۔ میں خوب ہنستی کیونکہ چچا جان بالکل برابر کے حصے بناتے تھے۔ چچا جان مجھے اور لالہ رخ کو کوئی بھی کام دیتے تو ہم خوب دل لگا کر کرتیں۔ جس پر وہ ہماری بہت حوصلہ افزائی فرماتے۔ وہ دن بہت سہانے تھے۔ ایک روز میں نے اور لالہ رخ نے کیک بنائے۔ کوئلے سُلگا کر اینٹوں پر لوہے کا بڑا ڈبہ رکھا جاتا تھا جس میں کیک بنانے کا مواد سانچوں میں بھر کے رکھا جاتا۔ بے حد لذیذ کیک بنتے تھے۔ ہم نے پہلی بار کوشش کی تھی۔۔۔ کیک سانچوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تو ساری خوبصورتی ختم ہو گئی۔ ہم دونوں مایوس تھے۔ ہم نے کیک کے ٹکڑے جوڑ کر ساخت درست کرنے کی کوشش کی اور پلیٹ سجا کر چچا جان کے پاس لے گئیں۔ وہ خوب ہنسے اور کیک چکھ کر بولے: "بہت مزے دار ہیں۔۔۔ میرے لیے آسانی بھی ہے کہ مجھے توڑنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ بھئی واہ۔۔۔ ذائقہ تو بہت عمدہ ہے۔" یہ سن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

چچا جان انتہائی مہربان انسان تھے۔ خلوص تو ان کی ذات پر ختم تھا۔ ایک دفعہ میرے بھائی جان کو سعودی عرب جانے کا چانس ملا۔ ہمارے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔ آپ کو علم ہے کہ زمیندار طبقے کو فصلوں پر پیسے کی کمی نہیں رہتی جبکہ باقی دنوں میں تنگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ میری والدہ چچا جان سے مدد کی درخواست کرنے آئیں تو چچا جان سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر کہنے لگے مجھے تھوڑا وقت دو۔ دوسرے دن انہوں نے امی کو بلوایا اور مطلوبہ رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔ کافی عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے ماں جی کا زیور سراج سنار کو گروی رکھنے کو کہا تھا۔ سراج نہایت شریف النفس تھا۔ اس نے چچا جان کے احتراماً پاؤں چھوئے اور کہا شاہ صاحب زیور گروی نہ رکھوائیں ویسے ہی رقم ادھار لے جائیں، جب چاہیں لوٹا دیں۔ حامد بھائی جان کی شادی میری خوشگوار یادوں میں سے ایک ہے۔ لالہ رخ اور میں مل کر شاپنگ کرنے جاتیں۔ ہم نے ایک جیسے سوٹ بنوائے ہر رسم کو بھرپور خوشی سے ادا کیا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے سگے بھائی کی شادی ہے۔ مہندی کی رات ہم نے خوب ڈھولک بجائی۔ گاؤں کی عورتوں میں

لڈو تقسیم کیے۔ چچا جان خوش ہو کر سب کو بتاتے بخاری (لالہ رُخ) اور راجہ (فرحت) میرے پیر ستار ہیں۔ حامد بھائی کی بیگم بہت خوبصورت، تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہیں، جب بھی ان سے ملتی ہوں دل خوش ہو جاتا ہے۔ چچا جان ہم پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو انہیں حامد بھائی کے گھر جانا پڑا۔ میری باجی اور بھائی ان کے ساتھ جہلم گئے۔ لالہ رُخ نے سارا زیور مجھے دے دیا کہ چک جاتی لے جاؤ اور سنبھال رکھنا۔ وہ زیور ہمارے گھر بارہ سال رہا، آخر کار لالہ رُخ کی شادی پر واپس کیا۔ چچا جان کہا کرتے مخلص انسان کی قیمت زیور اور روپے پیسے سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے۔ انہی دنوں حامد بھائی کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ لالہ رُخ کے کہنے پر چچا جان نے اس کا نام علی رضا رکھا اور اپنے ہاتھ سے سونے کی انگوٹھی، جس پر A کا ڈیزائن بنا ہوا تھا، اتار کر بچے کو پہنا دی۔

فالج کے مرض میں چچا جان طویل عرصہ تک مبتلا رہے مگر ان کی شگفتگی میں زیادہ فرق نہ آیا۔ البتہ لکھنے کا عمل رُک جانے کے باعث کبھی کبھار اداس ہو جاتے۔ جب وہ جلال شریف آتے تو میں بھی لالہ رُخ کے ساتھ ان کی خدمت کرتی۔ مجھے حیرانگی ہوتی کہ لالہ رُخ ان کی دیکھ بھال یوں کرتی، جیسے ماں اپنے بچے کی دیکھ بھال کرتی ہو۔ انہیں نہلاتا، دھلاتا، شیو کرتا، ہاتھ پاؤں خوب صاف کر کے ناخن تراشا اور کریم مل کر مساج کرتا، ان کے پسندیدہ کھانے بناتا۔ کھانے میں چچا جان کو پلاؤ، کباب اور مرغ کا شوربہ بہت پسند تھے۔ ماں جی ان کی پسندیدہ ڈش کدو کا حلوہ تیار کرتیں۔ ہم انہیں خوب باتیں سناتیں اور وہ خوش ہو جاتے۔ جلالپور شریف سے واپس آنے کو میرا دل ہی نہ چاہتا۔ بیماری کی حالت میں بھی چچا جان بیوہ اور محتاج عورتوں کی خاموشی سے مدد کر دیا کرتے تھے۔ لالہ رُخ بھی انسان دوستی کے جذبے میں شرابور تھی۔ مجھے یاد ہے گاؤں کی ایک نیم دیوانی عورت عاشاں ویرانی اکثر ان کے ہاں آتی اور سسرال والوں کی بے رحمی کے قصے سناتی کہ میرا جہیز چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنی چیزوں کی فہرست سناتی۔ لالہ رُخ اس کے بارہا سنائے قصے ہر بار نئے سرے سے سنتی۔ اسے کھانا کھلا کر خود کھاتی۔ وہ ہمیشہ اسی سے دکھ سکھ کرتی۔ سرگوشی میں اسے مخاطب کرتی ''بی بی جان جی!'' (لالہ رُخ کو گاؤں کی عورتیں احتراماً ''بی بی جان'' کہا کرتیں) اور بی بی جان اسے خوب تسلیاں دے کر ایک الگ کمرے میں چارپائی پر سلا دیتی۔ نجانے کب وہ جاگ کر خاموشی سے رخصت ہو جاتی اور ہفتے دس دن بعد پھر نمودار ہو جاتی۔

مجھے جب کبھی جہلم جانے کا اتفاق ہوتا تو چچا جان بہت خوش ہوتے۔ مجھے اور لالہ رُخ کو پلنگ کے دائیں جانب ریک میں رکھی کتابوں میں سے نوٹ نکال کر مجھے اور لالہ رُخ کو دیتے کہ جاؤ مرغ وغیرہ لا

کر مزے دار سالن بناؤ۔۔ ساتھ ہی چپکے سے کہتے پیٹیز اور کوک وہیں سے لے لینا۔ میں اور لالہ رُخ کبھی کبھار ایک ریڑھی والے سے نان کباب بھی کھا آتیں۔ ہائے وہ خوبصورت دن کہاں چلے گئے۔۔ ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گئی۔ جلالپور میں قیام کے دوران وہ باقاعدگی سے سیر کے لیے پہاڑوں کی طرف جاتے۔ ان دنوں ان کی صحت بہت شاندار تھی۔ بعض اوقات مجھے اور لالہ رُخ کو بھی بارش کے دنوں میں گھمانے لے جاتے۔ ہمیں فطرت کے دلنشیں مناظر دکھاتے، ان راستوں پر بھی لے جاتے جہاں سکندر اعظم اپنی فوج کے ہمراہ گزرا تھا۔۔ پناہ گاہیں اور درّے بھی دکھاتے جہاں سکندر اعظم نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ پہاڑوں سے پانی بہہ کر آتا تو نالہ گھنڈر خوب بھر جاتا۔ بہتے پانی میں چلنا اور چھینٹے اُڑانا ہمیں بہت پسند تھا۔ ان دل موہ لینے والے مناظر کو جب بھی یاد کرتی ہوں تو دل میں حسرت کروٹیں لینے لگتی ہے۔

جب بھی کبھی پاکستان جاتی ہوں تو اس خاندان کو ضرور ملتی ہوں، جہاں مجھے سچا پیار ملا، زندگی گزارنے کا طریقہ سلیقہ نصیب ہوا۔۔ زندگی کی اصل قدروں کا کھوج ملا۔۔ مجھیں تو میرا دوسرا میکہ چچا جان کا خاندان ہے۔ خصوصاً حامد بھائی اور لالہ رُخ کے گھروں میں مجھے بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ لالہ رُخ سے میں چچا جان کی باتیں کرتے نہیں تھکتی۔

چچا جان سے آخری ملاقات یاد آتی ہے تو آنکھوں سے اشک پُھوٹ پُھوٹ کر بہہ نکلتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں پاکستان گئی تو چھوٹی بیٹی آمنہ بھی ساتھ تھی۔ جہلم میں حامد بھائی کے گھر ایک بڑے کمرے میں وہ کھڑکی کے ساتھ بچھے پلنگ پر دراز تھے۔ میں ان کے گلے لگ کر رونے لگی، ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ماں جی دیر تک مجھے ساتھ لگائے رہیں۔ میری بیٹی کو بہت پیار کیا۔ اسے پیسے بھی دیئے۔ اس دن ہم نے بہت باتیں کیں۔ لالہ رُخ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں گوجرانوالہ مقیم تھی۔ اس کے بیٹے کے بارے میں مجھے بتایا۔ ہم جلالپور میں بیتے ایام کی یادیں دیر تک تازہ کرتے رہے۔ چچا جان نے بتایا کہ تمہارا جیٹھ آیا تھا تو میں نے اسے کہا کہ فرحت کی قدر کرنا وہ بہت اچھی ہے۔ میں پھر رونے لگی۔۔ اس اپنائیت کو تو میں ترس رہی تھی۔ چچا جان اور ماں جی نے مجھے اور آمنہ کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ جب میں رخصت ہوئی تو میرے غم کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ چچا جان بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور بائیں ہاتھ کو ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ اس کے بعد انہیں دیکھنا مجھے نصیب نہ ہوا۔

ہم پروفیسر سید حامد رضا (ر) پرنسپل کا وہ مضمون بھی شامل کرنا لازم سمجھتے ہیں جو انہوں نے ابا جان کی وفات پر ''اتحادِ اساتذہ'' میں تحریر کیا تھا۔ بطور بیٹا اور بطور شاگرد یہ تحریر محبت، عقیدت اور تحسین کے احساسات سے مملو ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس تحریر میں ابا جان کے اُن خطوط کا حوالہ بھی موجود ہے جو مکمل صورت میں میرے پاس نہیں ہیں۔ ان خطوط پر حامد بھائی جان کا تبصرہ بھی نہایت گراں قدر ہے جس سے ابا جان کی شخصیت اور کردار کے کئی نئے پہلو منعکس ہوتے ہیں۔ (لالہ رُخ)

سید حامد رضا

علی عباس جلالپوری ـــــ ایک مثالی اُستاد

اگر چہ یہ لکھتے ہوئے دل بھر آتا ہے کہ آج والد محترم اس دنیا میں نہیں رہے لیکن یہ خیال تسکین بخش معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی پردہ کے باوجود وہ اپنی تصویروں تحریروں اور خیالات و تاثرات کی دنیا میں موجود ہیں۔ اگر چہ ابدی جدائی کا دُکھ مجھے ذاتی لگا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ کرب اب ہمارے فہمیدہ اور باشعور افراد میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ سوچا کیوں نہ چند باتیں کرلوں کہ ہم سب کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہو۔ کچھ سہارا ملے، کچھ ولولہ حاصل ہو۔

میرے فہم کے مطابق وہ سرتاپا استاد تھے۔ درویش اور بے غرض استاد جو اپنی زندگی میں اول تا آخر علم حاصل کرتا اور بانٹتا رہتا ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد معاشرے کو مہذب بنانا، جہل کے اندھیروں کو دور کرنا اور عقل پسندی کو معاشرے کا شعار بنانا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آپ بی اے کے طالب علم تھے کہ ہمارے دادا جان کا انتقال ہوگیا۔ دادی جان نے بڑی مشکل سے زیور بیچ باچ کر ان کو گریجویشن کروائی پھر دس بارہ سال سوتیلے رشتہ داروں، نامہرباں برادری اور بے روزگاری کا پُر آشوب دور گزرا جس نے بقول اُن کے ان کے سرچشمۂ حیات کو مکدر کر دیا۔ البتہ اس دوران مطالعہ اور موسیقی کا ذوق و شوق جاری رہا جس نے انھیں زمانے کی کلفتوں کے باوجود زندہ رکھا۔ ایک دفعہ انہوں نے بتایا کہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ میں فلسفہ اور موسیقی دونوں میں کس چیز کا انتخاب کروں بہر حال فیصلہ فلسفے کے حق میں ہوا۔ کتابوں میں سر دے کر گویا وہ اردگرد کی تلخیوں کو بھول جایا کرتے تھے۔ جلالپور شریف میں ایک آریہ سماجی رائے بہادر ہری رام کالیہ نے سکول قائم کیا تھا اس میں ایک دو سال پڑھایا۔ ملازمت کے انتظار میں عمر زیادہ ہوتی دیکھ کر انہوں نے ۱۹۳۵ میں سی ٹی کا کورس کر لیا اور مدرس کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ سرکاری ملازمت مل جانے کے بعد پنڈ دادن خان، چکوال، بھوچال کلاں اور پنڈی گھیب میں بطور مدرس فائز رہے۔ اسی دوران ایم اے اردو، ایم اے فارسی اور ایم اے فلسفہ اعزاز کے ساتھ پاس

کیے۔

ایمرسن کالج ملتان میں بطور لیکچرار اردو تعینات ہوئے۔ وہاں کی لائبریری بہت شاندار تھی۔ جس سے آپ نے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ اس لائبریری کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں آٹھ یا نو سال کا تھا۔ ہمارا گھر پل شوالہ کے قریب تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے بڑا سا صحن جس میں دھول اڑتی تھی۔ بجلی ندارد اور ابا جان ہیں کہ کالج سے واپسی پر آرام کرنے کے بعد میز کرسی پر بیٹھ گئے اور کسی کتاب سے کاپی پر کچھ منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ملتان کی گرم دوپہر ہے لیکن ادھر ایک ہاتھ میں دستی پنکھا اور دوسرے میں قلم۔ میں لیٹا دیکھتا رہتا حتیٰ کہ اونگھ آ جاتی لیکن جب آنکھ کھلتی یہی منظر سامنے ہوتا۔ ملتان سے ہم گوجرانوالہ آ گئے۔ یہاں میز کرسی کی جگہ غالیچے نے لے لی۔ اسی طرح لاہور میں میز کرسی اور پلنگ۔ لیکن مطالعہ کرنے، نوٹس لینے اور لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ تبادلہ ہو گیا جہاں آپ نے نو سال گزارے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ ملتان سے گوجرانوالہ کیوں تبادلہ کرالیا۔ جہلم وغیرہ کیوں نہ آئے۔ کہا دراصل میں لاہور کی لائبریریوں کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ گوجرانوالہ قیام کے دوران "روح عصر" کو آخری شکل دی گئی۔ یہیں "روایات فلسفہ" کی تشکیل ہوئی جسے مکمل لکھنے میں پانچ سال کا عرصہ لگا۔ "اقبال کا علم کلام" پہلے مضامین کی شکل میں بالاقساط شائع ہو رہی تھی ان مضامین میں اقبال اور مولانا مودودی پر تنقید کی وجہ سے بہت کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن حقیقت اور سچ کے متلاشی تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ پہلے رائے قائم کر کے تحقیق کرنا غلط اور غیر سائنسی ہے۔ پہلے اچھی طرح تحقیق کر کے جو رائے قائم کی جائے وہی درست ہوتی ہے خواہ وہ آپ کے مروجہ خیالات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چنانچہ جو بھی رائے قائم کی اس کا برملا اظہار کیا اور اس پر قائم رہے۔

۱۹۶۷ء میں ترقی پا کر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور چلے آئے اور یہیں سے ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ پنجابی کا آغاز کرنے والوں میں شامل ہوئے اور دو سال یہیں گزارے۔ لاہور میں روایات تمدن قدیم"، "عام فکری مغالطے"، "مقامات وارث شاہ"، وحدت الوجود تے پنجابی شاعری"، "تاریخ کا نیا موڑ"، جنسیاتی مطالعے کے علاوہ متعدد مضامین لکھے گئے۔ مضامین کی ایک جلد "مقالات جلالپوری" کے عنوان سے شائع کروائی۔ ۱۹۷۹ء میں جلال پور شریف چلے آئے اور یہیں ۱۹۸۲ء تک کائنات اور انسان، خرد نامہ جلالپوری، رسوم اقوام، میرا بچپن اور لڑکپن، پریم کا پنچھی پنجھو پیارے (ناولٹ) جہلم کے گرد و نواح میں مستعمل پنجابی الفاظ و محاورے اور سید گل چیں مکمل کیں اور انہیں آخری شکل دی۔ ڈائری کے چند اوراق سنگ ریزے کے نام سے اور ایک کتاب "یہ

جہانِ رنگ و بو" بوجہ علالت نامکمل رہ گئے پھر بھی چالیس کے قریب نوٹ بکس ہیں جن میں بہترین کتابوں کے اقتباس موجود ہیں۔ اُن کی لائبریری میں دراصل یہی نوٹ بکس تھیں کہ جو بھی عمدہ کتاب پڑھی اس سے نوٹس لے لیے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب یہ نوٹس دیکھتا ہوں تو گویا ساری کتاب سامنے آ جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ساری کاپیوں سے کتابوں کی ایک فہرست تیار کی۔ جب انہیں دکھائی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے تم نے بڑا کام کیا۔ بہت وقت لگا ہوگا۔ میں نے کہا اتنا نہیں لگا آپ کے تو سال ہا سال لگ گئے۔ یہ سُن کر مسکرانے لگے۔ میں نے کہا آپ نے اتنا کام کیسے کر لیا۔ کہا دراصل میری کوئی مجلس نہیں تھی نہ کسی کے ہاں آنا جانا۔ میں نے پڑھنا لکھنا ہی تھا اور کیا کرتا؟ چند سال ہوئے ایک دوست نے پوچھا کہ جناب آپ کے اوقاتِ مطالعہ کیا ہوتے تھے۔ کہا اوقات کیا ہوتے۔ مطالعہ ہی مطالعہ ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تھوڑا تھوڑا ہی سہی لیکن روز اور باقاعدگی سے کچھ کیا جائے تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۴ میں علالت کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جو تقریباً چالیس سال سے چل رہا تھا منقطع ہو گیا۔ دایاں ہاتھ متاثر ہو جانے پر ہمیشہ آزردہ رہے۔ اکثر و بیشتر کہتے کہ میں نے اور بہت کچھ لکھنا تھا یا یہ کہ میں تو مر اسی وقت گیا تھا جب میرا ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔ اب تو محض وقت گزاری ہے۔ بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی لیکن دائیں ہاتھ میں رعشہ نمودار ہونے سے کامیابی نہ ہوئی۔ لکھوانے کے وہ قائل نہ تھے اس عرصہ میں صرف "کائنات اور انسان" کا دیباچہ ہی لکھوایا۔ چودہ سالوں میں علالت کے باوجود شگفتگی طبع رہی حالانکہ ان کے آخری نو سال بستر پر ہی گزرے۔ ڈاکٹر اور دوسرے ملنے والے ان کی زبردست قوتِ ارادی کے معترف تھے کہ یہ کیسا مریض ہے جسے موت کا ذرا بھی خوف نہیں ہے۔ وہ اکثر بیمار پرسی کرنے والوں سے کہتے کہ بیماری کا مجھ سے اتحاد ہو گیا ہے اب یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ چند سال ہوئے ایک خاتون نے دیوار پر لگی ہوئی ان کی تصویر کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے؟" کہنے لگے، "جب میں زندہ تھا۔" ان سالوں میں ایک دفعہ جب ۱۹۸۶ میں پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے اور ۱۹۸۹ میں بے نظیر بھٹو حکومت کی جانب سے ان کی علمی خدمات کو سراہا گیا تو بہت خوش نظر آتے تھے کہ حکومتی سطح پر اعتراف تو ہوا یا پھر اپنی ہر نئی چھپنے والی کتاب جس کا اہتمام ظفر علی خاں کرتے تھے، کو دیکھ دیکھ کر ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمک اُٹھتا تھا۔

آپ نے ساری عمر تعلیم و تدریس کے عشق میں گزار دی۔ روپیہ پیسہ کو زندگی کی ایک ضرورت سمجھا زندگی کا مقصد نہیں ورنہ ان کو لکھ پتی بننے کے کئی مواقع میسر آئے جو انہوں نے پایہ حقارت سے ٹھکرا دیئے۔ ہمیشہ اپنے وسائل میں گزارہ کیا اور اس کے باوجود حتی الوسع بے کسوں کی مدد بھی کرتے رہے۔

انہیں اپنے علم و فضل کا مان تھا کیوں نہ ہوتا۔ اُن کا خیال تھا کہ دولت مندوں کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہوتا ہے تو ہمیں اپنے علم پر کیوں نہ مان ہو۔ وہ کہتے تھے کہ اہلِ علم کو اپنی عزت آپ کروانی چاہیے کہ دولت مند اُن کے در پر آئیں نہ کہ یہ اُن کے آگے پیچھے پھرتے رہیں۔ انہوں نے ٹیوشن زندگی بھر نہیں پڑھائی البتہ جس کسی نے رہنمائی چاہی اس کی بخوشی مدد کی۔ وہ بنیادی طور پر استاد تھے۔ ان کی وفات پر جلالپور میں اُن کے ۱۹۴۴ء کے زمانے کے شاگرد بھی آئے جنہوں نے کہا کہ ایسا استاد ہم نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے گاؤں میں اپنے اردگرد جو قابل طالب علم نظر آیا اس کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی تاکہ پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

خرد افروزی، عقلیت پسندی، سائنسی اندازِ فکر کا فروغ اور حصولِ عظمت ان کا نصب العین تھا جس کا تعین انہوں نے شروع سے ہی کر لیا تھا اور مشکل حالات کے باوجود اس سے دستبردار نہ ہوئے ایک دفعہ میرے ایک خط کے جواب میں لکھا — ''اپنی روداد لکھنے کا مقصد یہی تھا کہ نامساعد حالات میں گھر جانے کے باوجود احسن طریقے سے زندگی گزارنے کی کوشش کی جا سکتی ہے اور آدمی کانٹوں کے زخموں سے نڈھال ہونے کے باوجود پھول کی خوشبو سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ عزیزِ من! زندگی بڑی قیمتی متاع ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو کیڑے مکوڑوں کی طرح نہیں رہنا چاہتے بلکہ زمانے کے ریگ زار پر اپنے نقوشِ کفِ پا چھوڑنے کے بھی متمنی ہوتے ہیں۔'' طویل علالت کے باوجود روزمرہ کے معاملات اور کتب بینی کا شغل ایسے ہی جاری رہا جیسے کہ صحت مند انسان کا ہوتا ہے۔ البتہ ایک سال سے وہ تھکے ہوئے نظر آنا شروع ہو گئے تھے کہ بس بھئی بہت ہو چکا اب یہ سلسلہ غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے۔ پڑھنا وغیرہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب تنہائی انہیں ستاتی تھی حالانکہ اسی تنہائی سے انھیں ساری عمر لگاؤ رہا۔ زندگی کے مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی۔ بچوں کے فرائض ادا ہو چکے تھے۔ بنیادی تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ باقیوں کی فکر نہ تھی کہ شائع نہ ہو سکیں گی۔ ہماری کوشش ہی رہی تھی کہ ان کے معمولات جاری رہیں لیکن بھرپور زندگی کا اختتام ہو رہا تھا جسے وہ بخوبی سمجھ رہے تھے اور ہم نادانی میں کچھ بیٹھے تھے کہ ایسا نہ ہوگا۔ ہم ہونی کو انہونی میں بدلنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تو بیماری کے خلاف سپر رکھ دی تھی لیکن مجھے ضد سی ہو گئی تھی۔ جب کبھی بھی مرض شدت پکڑتا تو میری بھاگ دوڑ میں اضافہ ہو جاتا اور جب انہیں آرام آ جاتا تو میں سمجھتا جیسے میں نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ ایک ماہ پہلے کہنے لگے میرا وقت قریب آیا اور مجھے تم نے تکلیف میں دیکھا تو بے شک ڈاکٹر کو کہہ دینا کہ مجھے ٹیکہ لگا دے۔ میں نے کہا یہ بھی کوئی بات ہوئی آپ تو ٹھیک ہیں ایسا نہ سوچا کریں مگر حالتِ سکرات میں انھیں دیکھ کر اپنی بے بسی پر میں جو رویا چلایا تب سمجھ میں

بات آئی کہ وہ اپنی تکلیف کا نہیں میری تکلیف کو ذہن میں رکھ کر ایسا کہہ رہے تھے۔ وفات سے دس دن پہلے صحت میں بحالی کے آثار نمودار ہوئے تو کہنے "لگتا ہے بچ گئے"۔ میں نے کہا "جی ہاں دونوں بچ گئے ہیں۔" یہ سن کر مسکرانے لگے۔ اس کے دو دن بعد ڈرپ لگی ہوئی تھی میں پاس بیٹھا ہوا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اچانک میری نظر ان کے چہرے پر پڑی تو بڑے پیار سے دیکھ رہے تھے میں تاب نہ لا سکا۔ نظریں جھکا لیں۔ جدائی کے وسوسے نے آنکھوں میں آنسو بھر دیئے آنکھیں پونچھ کر ان کی جانب دیکھا تو نظریں جھک چکی تھیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

افضل توصیف پریشان ہیں کہ پت جھڑ کا موسم لگا ہے۔ مشاہیرانِ علم وفن رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے دسمبر میں بوسیدہ اور سال خوردہ پتے گر جاتے ہیں لیکن اس اُمید پر کہ ٹہنیوں پر نئے پتوں کو جگہ مل سکے گی۔ انسانی تہذیب وتمدن کا درخت ابھی مردہ نہیں ہوا۔ بہار کی اُمید تو اس سے پیوستہ رہ کر ہی کی جا سکتی ہے۔ جلالپوری صاحب کا بھی زاویہ نظر رجائی تھا۔ بیس سال پہلے میں نے انہیں خط لکھا تھا کہ معاشرے نے آپ کی خدمات کو سراہا نہ ہی قدر کی ہے کہ جس پایہ کی آپ کی کنٹری بیوشن ہے اس طرح کا مقام بھی ملنا چاہیے تھے۔ اس کے جواب میں لکھا، "میری کنٹری بیوشن کا عزیز نے ذکر کیا ہے۔ مجھے اپنی ناقدری کا کوئی گلہ نہیں ہے کیوں کہ اپنی شہرت اور امیج کو فضل فروشوں کی طرح کیش نہیں کرانا چاہتا۔ اپنی توفیق کے مطابق چپکے سے کام کیے جا رہا ہوں اور مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ میری بات بعض ہوش مند اور ذی شعور نو جوانوں تک پہنچ گئی ہے۔ جلالپوری صاحب کو ہوش مند اور ذی شعور نو جوانوں سے توقعات تھیں۔ اُمید ہے وہ خرد افروزی کی اس شمع کو اوہام وخرافات کے گھور اندھیروں میں روشن رکھنے کی جستجو کرتے رہیں گے۔

آفتابِ خرد افروزی

پروفیسر ظفر علی خان

چھ دسمبر ۱۹۹۸ء کو آفتاب خرد افروزی پروفیسر علی عباس جلال پوری اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ لیکن اپنے پیچھے اپنی تصانیف کی صورت میں انمٹ نشان چھوڑ گئے جو ان کے ہزاروں مداحوں اور پیروکاروں کے لیے علم و آگاہی کا درخشاں باب ہیں۔ انہوں نے پوری زندگی مطالعہ و تدریس و تحقیق و تصنیف میں گزاری۔ وسیع مطالعے اور تحقیق کے نتیجے میں یہ حقیقت ان پر آشکار ہوئی کہ مشرقی اقوام بالعموم اور مسلم اقوام بالخصوص، اس لیے پس ماندہ اور دست نگر ہیں کہ وہ ابھی تک زرعی معاشرے کے فرسودہ معتقدات اور اوہام میں جکڑی ہوئی ہیں۔ مغربی معاشرے تو کب کے تحریک احیائے علوم سے گزر کر آج فلسفہ، سائنس اور علوم ہائے انسانی کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ جبکہ ہم قرون وسطی کی سمیات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ علمی سطح پر تحریک خرد افروزی شروع کی جائے۔ اور یہ عمل تحقیق و تصنیف تقریباً پچیس تیس سال جاری رہا۔ زندگی کے آخری چودہ سال دائیں حصے پر فالج کے حملے کی نذر ہو گئے۔

انہوں نے فکری جمود کے ماخذات کی نشاندہی کی اور اپنی تیرہ مطبوعہ کتب میں ان ماخذات اور ان کے تاریخی عواقب کو بے نقاب کیا اور ثابت کیا کہ وہ مغالطوں پر مبنی اور ازکار رفتہ ہیں۔ مثلاً پیداواری عمل اساس اول ہے۔ پیداواری اور خاندانی رشتوں کے تانے بانے سے سماج صورت پذیر ہوتا ہے۔ زرعی معاشرے میں زرخیزی کے متعلق فصلوں کی بیجائی کٹائی سے منسلک تہوار، رسمیں، تقریبات، ماورائی وجود کا تصور جو موسموں کو موافق بنائے، مٹی میں زرخیزی پیدا کرے، آفات فطرت سے بچائے،

نوٹ: درج بالا مضمون دراصل "اتحاد اساتذہ" جنوری ۱۹۹۹ء کی اشاعت کا اداریہ ہے جسے علی عباس جلالپوری کی وفات کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ پروفیسر ظفر علی خان نے اس اداریے میں جلالپوری کی تصانیف کا کماحقہ جائزہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کتاب کی تکمیل ہو سکے۔

قربانی، جادو ٹونے ٹوٹکے۔۔۔لیکن صنعتی سماج کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔ دیہی کی بجائے شہری سماج، کھیت کی بجائے کارخانہ، فطرت پر انحصار کی بجائے پیداوار پر کنٹرول، سماجی تنظیم میں پیچیدگی۔ ماس پیداوار اور ماس کھپت، نت نئی ایجادات اور نت نئی منڈیاں اور منڈیوں کے حصول کیلئے تگ و دو۔۔۔۔لہذا زرعی دور کے معتقدات، صنعتی دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہتے۔ روح عصر اسی حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔

ماضی سے ورثے میں ملے ہوئے اعتقادات ہمارے مزاج عقلی میں اس طرح نفوذ کر جاتے ہیں کہ ہم درپیش حقیقتوں کو جیسی کہ وہ ہیں، دیکھ نہیں سکتے، سمجھ نہیں پاتے۔ مثبت و منفی تعصبات ہماری فکری صلاحیت کو متاثر کرتے ہیں تو خیالات گدلا جاتے ہیں۔ ہم مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جو نسل در نسل جاری رہتے ہیں۔ موضوعی سچ بن جاتے ہیں، یوں معاشرہ فکری انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ علی عباس جلال پوری نے اس جمود کو توڑنے کے لیے ان مغالطوں کا تاریخی اور فکری پس منظر دیتے ہوئے منطقی استدلال سے انہیں باطل قرار دیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ ''یہ'' کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے''۔ ''یہ'' کہ انسانی فطرت نا قابل تغیر ہے''۔ ''یہ'' کہ وجدان کو عقل پر برتری حاصل ہے''۔ ''یہ'' کہ دولت مسرت کا باعث ہوتی ہے''۔ ''یہ'' کہ تصوف مذہب کا جزو ہے''۔ ''یہ'' کہ عورت مرد سے کمتر ہے''۔ ''یہ'' کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے''۔ ''یہ'' کہ ریاست اور مذہب لازم و ملزوم ہیں''۔ یہ ''کہ اخلاقی قدریں ازلی و ابدی ہیں'' وغیرہ عام فکری مغالطے کے موضوعات ہیں۔

فلسفہ سوال اٹھاتا ہے۔ سوال تحکیمیت کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے آپ نے ضروری سمجھا کہ ان سوالوں کو دوبارہ اٹھایا جائے جو ذہن انسانی کو قدیم زمانے سے تنگ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً کائنات کیا ہے؟ کیا اس کی کوئی غائت ہے؟ کیا اس میں کوئی ذی شعور اخلاقی قوت موجود ہے؟ زمان و مکان کیا ہیں؟ انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے؟ کیا ذہن مادے کی پیداوار ہے یا مادہ ذہن کی؟ انسان مجبور ہے یا مختار؟ روح کیا ہے؟ ضمیر کیا ہے؟ حسن کیا ہے؟ سچائی کیا ہے؟ خیر کیا ہے؟ مختلف فلسفیوں نے ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ قدماء نے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ معروضی دنیا کو جاننے کے لیے مشاہدے اور استدلال کا استعمال کیا۔ لیکن بعد میں مابعد الطبیعاتی امثال پسندی حاوی ہوگئی۔ تجربیت، ارادیت وارتقائیت کے مراحل سے گزر کر فلسفہ اب پھر جدلیاتی مادیت کے انضمام فکر و عمل کے ذریعے حقائق کو سمجھنے اور تبدیل کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ موجودیت اسی کی ایک فرع ہے۔ ''روایات فلسفہ'' عام فہم

اردو میں اس لیے لکھی گئی۔

''شاید چند ایک روزن اور دریچے کھل جائیں گے اور چند ایک تازہ ہوا کے جھونکے (ذہن) کی بند کوٹھڑیوں میں بار پاسکیں گے۔ نئے نئے خیالات آدمی کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ نئے نئے خیالات کا نفوذ شدید ذہنی کرب کا باعث بھی ہوتا ہے۔ لیکن دیانت اور جرأت سے کام لے کر ایسے نئے خیالات کو قبول کر لیا جائے جن کی صداقت آشکار ہو چکی ہے تو یہ کرب مسرت میں بدل جاتا ہے۔ اور اس سے بڑی مسرت کا کم از کم راقم کو کوئی تجربہ نہیں ہے''۔

فلو نامی یہودی نے سب سے پہلے یہودیوں کے مذہبی عقائد کو یونانی فلسفہ کے قالب میں ڈھالا اور مذہبی عقائد کے لیے عقلی جواز فراہم کیے۔ بعد ازاں عیسائی اور مسلمان مفکرین نے بھی اپنے اپنے مذہبی عقائد کے جواز تراشنے شروع کر دیے۔ دنیائے اسلام میں یونانی کتابوں کے ترجموں سے ہیجان پیدا ہوا تو معتزلہ نے عقلی دلائل سے مذہب اسلام کا دفاع کیا۔ اور علم کلام کے اصول مرتب کیے۔ مسلمانوں میں رازی اور غزالی مشہور متکلم ہو گزرے ہیں۔ فلسفہ پہلے سے قبول کیے ہوئے کسی عقیدے کے حق میں عقلی جواز فراہم کرنے کا نام نہیں ہے۔ فلسفہ تو سوال اٹھاتا ہے اور عقلی استدلال اور تحقیق سے جو جواب حاصل ہو (چاہے وہ آدمی کے اپنے اعتقادات کی نفی کرے) کا بلا جھجک اظہار کرتا ہے۔ علامہ اقبال اس لیے فلسفی نہیں ہیں کہ وہ اپنے اعتقادات کے حق میں عقلی جواز تراشتے ہیں اور فلسفیانہ سوالات کو عقلی استدلال سے منطقی نتائج پر نہیں پہنچاتے بلکہ خرد دشمنی اور رومانوی عشق نوازی میں غلطاں ہیں۔ ان کے اکثر افکار بھی معاصر مغربی مفکرین شوپنہائر، نطشے، فشٹے اور برگساں وغیرہ کے افکار کا ایک ملغوبہ ہیں جسے انہوں نے مشرقی جامہ پہنا دیا ہے۔ پاکستانی سماج میں اقبال پر تنقید تو شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگانے سے کم نہیں۔ علی عباس جلال پوری اقبال کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ اور اس پر لکھنا بھی چاہتے تھے لیکن بیماری کی وجہ سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ (اقبال کا علم کلام)

فلسفیوں اور مفکروں میں خدا کے تصور کی دو روایتیں چلی آ رہی ہیں۔ ایک وحدت الوجود اور دوسری وحدت الشہود۔ وحدت الوجود کا اساسی تصور یہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی اصل اصول کارفرما ہے۔ کثرت جو ہمیں دکھائی دیتی ہے ہماری اپنی نظر کا فریب ہے۔ وحدت الوجودی کہتے ہیں کہ خدا کائنات سے الگ نہیں ہے۔ وہ کائنات میں طاری و ساری ہے۔ وحدت الشہودیوں کے خیال میں خدا کائنات سے ماورا اور الگ تھلگ ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ سامی مذاہب

بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے وحدت الوجود کا نظریہ قدیم یونان میں پارمنیا ئڈیس نے پیش کیا۔ بعد ازاں زینو اور فلاطینوس نو اشراقی نے بھی اس کا احیا کیا۔ ہندوؤں میں شنکر اچاریہ نے ویدانت کی صورت میں اسے یوں پیش کیا کہ صرف برہمن ہی کائنات ہے۔ وہی حقیقی ہے۔ اس کے سوا سب کچھ مایا ہے۔ مسلمانوں میں ابن عربی، رومی، عطار اور جامی وغیرہ مشہور وجودی صوفی ہو گزرے ہیں۔

مادری زبان پنجابی میں لکھی گئی کتاب ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' میں علی عباس جلالپوری نے خطۂ پنجاب کے تاریخی، نسلیاتی و ثقافتی پس منظر کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے کہ کس طرح دراوڑی سماج ایک ترقی یافتہ سماج حملہ آور آریاؤں کے تسلط میں آیا اور کیسے یہاں یونانی سریت و اشراق، ہندی ویدانت و بھگتی تحریک اور مسلمانوں کے تصوف و عرفان کی آمیزش سے وحدت الوجودی صوفی شاعری تخلیق ہوئی جو صلح کل وسعت مشرب اور امن و آشتی کی اقدار کی آئینہ دار ہے اور جس کی بدولت یہاں بابا فرید، شاہ حسین، وارث شاہ اور خواجہ فرید جیسے عظیم شعراء کا وجود ممکن ہوا۔

بیسویں صدی ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے گرد گھومتی ہے۔ پہلی بار بڑے پیمانے پر ایک فلسفۂ فکر و عمل نے دنیا کی کایا کلپ کر دی۔ مارکسی نظام فکر و عمل نے دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب کے ذریعے پسماندہ زرعی معاشروں میں محیر العقول ترقی، عدل و مساوات کا دور شروع کیا۔ تاریخ نے ایک نیا موڑ کاٹا۔ عوام جو طبقاتی معاشروں میں غیر اہم اور بے مایہ تھے اب اہم اور تاریخ ساز سمجھے جاتے ہیں۔
(تاریخ کا نیا موڑ)

طبقاتی استحصالی نظاموں میں جنس جیسے فطری جذبے کو کس طرح اوہام اور ممانعات میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ اسے استحصال و بے راہ روی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے فکری عوامل کو سائنسی طریقے سے سمجھا جائے اور اس کی معاشرتی اہمیت کے پیش نظر اسے صنفِ لطیف سے ناانصافی اور اسے مقید کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ استحصالی نظام زر میں خرید و فروخت اور تذلیل رواج پاتی ہے۔ ان رجحانات کی بیخ کنی ضروری ہے۔ (جنسیاتی مطالعے)

آج کی رسمیں اور ریتیں کس طرح کے سماجوں سے ماخوذ ہیں ان میں آج بھی پرانے اوہام و معتقدات جھلکتے ہیں۔ جیسے ان سے لوگ شعوری طور پر آگے نکل آئے ہوں۔ ہم آج کے رسوم و رواجوں میں عقلی جواز کے بغیر عادتاً ملتاں ہوتے ہیں کہ انسانی تاریخ ایک تسلسل ہے، رک کر سوچنا چاہیے کہ ہم کیا اور کیوں کر رہے ہیں۔ (رسوم اقوام)

بعض الفاظ و اصطلاحات غلط العام ہیں۔ یا لوگ ان کے پس منظر سے ناواقف ہیں۔ یہ ناواقفیت یا کم فہمی ذہنی آلائش وفکری جمود کا باعث بنتی ہے۔اس لیے ان الفاظ واصطلاحات کے علمی و تحقیقی و تاریخی معنی دیے گئے ہیں تاکہ بند در کھل جائیں۔ (خردنامہ جلال پوری)

''خردنامہ'' کے پیش لفظ میں خردافروزی کے ترکیبی عناصر کو خود بیان کرتے ہیں۔ (۱) عقلیت پسندی کی ترویج۔ (۲) سائنس اور فلسفے کو مذہبی تحکم سے نجات دلانے کی کوشش۔ (۳) انقلابیت و عقلیت پسندی یا سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرے کو ازسرِ نو مرتب کرنے کی کوشش۔ (۴) مذہبی منافرت اور جنون کا انسداد۔ (۵) انسان دوستی۔

مُشتِ از خروارے کے مصداق ان کی کچھ تصانیف کا سطحی سا تعارف یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے طے کیے ہوئے خردافروزی کے راستے پر استقامت اور لگن سے چلتے رہے۔ انہوں نے عقیدہ پرستی کے مقابلے میں عقلیت و تحکم کے مقابلے میں استدلال، فوریت کے مقابلے میں تاریخیت، دوامیت کے مقابلے میں جدلیات، امثالیت پسندی کے مقابلے میں مادیت پسندی اور سرمائے کے مقابلے میں عظمتِ محنت کا علم بلند رکھا۔ ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ان کے فرزند ارجمند پروفیسر سید حامد رضا اور دُختر نیک اختر پروفیسر لالہ رُخ بخاری خردافروزی کی وہ شمع جو ان کے جلیل القدر والد نے روشن کی تھی، بجھنے نہ دیں گے۔

Will Durant
5608 Briarcliff Road
Los Angeles 28, Cal.

May 6, 1955

Professor S Ali Abbas
Emerson College
Multan
West Pakistan

Dear Professor:

Your letter of April 25 has been a tonic to me. You will understand how difficult it was for me, provincialized in America, to write about Islamic civilization without making errors that must seem to a Moslem scholar quite unforgivable. I am filing your letter, and its generous and patient corrections, along with other chastisements received, against the time when a revised edition of my books may be called for. Many, many, thanks.

Sincerely,

Will Durant

مشہور مورخ وِل ڈیورانٹ کے پروفیسر علی عباس کے نام تحریر کردہ خط کا عکس

NATIONAL BOOK COUNCIL OF PAKISTAN
MINISTRY OF EDUCATION
GOVERNMENT OF PAKISTAN

CERTIFICATE OF COMMENDATION

In recognition of his life-long and outstanding services to Learning and Enlightenment, Syed Ali Abbas Jalalpuri is hereby awarded this Certificate of Commendation.

4th November, 1989.

Benazir Bhutto

PRIME MINISTER OF PAKISTAN.

وزیراعظم پاکستان بینظیر بھٹو کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈ کے سرٹیفکیٹ کا عکس

پروفیسر لالہ رُخ بُخاری کی تصانیف

- ☆ ترصد (ناول)
- ☆ خواب ہوئے مہتاب (ناول)
- ☆ مکاتیبِ علی عبّاس جلالپوری (مرتبہ)
- ☆ میری یادیں (علی عباس جلالپوری کے حوالے سے) (زیرِ طبع)
- ☆ جعفر عباسہ ناول (زیرِ طبع)
- ☆ رنگِ لالہ (شعری مجموعہ) (زیرِ طبع)

سیّد علی عباس جلالپوری کی فکری کتابیں

روایات تمدن قدیم

مقالات جلالپوری

رسوم اقوام

خرد نامہ جلالپوری

جنسیاتی مطالعے

عام فکری مغالطے

تاریخ کا نیا موڑ

روایات تمدن قدیم

روح عصر

کائنات اور انسان

اقبال کا علم کلام

مقامات وارث شاہ

روایات فلسفہ

وحدت الوجود تے پنجابی شاعری

سید گلچین

6۔ بیگم روڈ، لاہور فون: 042-37238014

Email: takhleeqat@yahoo.com www.takhleeqatbooks.com